الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

انسان کامیاب ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے
مگر اپنی غفلت سے وہ
اپنے آپ کو ناکام بنا لیتا ہے

دسمبر ۱۹۸۹
شمارہ ۱۵۷

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ

جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۷ دسمبر ۱۹۸۹

فہرست

	صفحہ		صفحہ
صاحب معرفت	۲	آدھا حل	۱۵
چیلنج نہ کہ خطرہ	۳	جھوٹی توجیہہ	۱۶
ترک فاتح	۴	حل کی طرف	۱۷
بددعا نہیں	۶	مفاد کی سیاست	۲۳
زندہ لوگ	۷	آخر سے آغاز	۲۵
ایک مثال	۸	ایک موت	۲۶
مہنگی قیمت	۹	روس میں اسلام	۲۸
چپ کی طاقت	۱۰	تجارت کا میدان	۳۰
بے بصیرت، با بصیرت	۱۱	شکایت یا تدبیر	۳۲
قومی توہین	۱۲	سفرنامہ — قسط ۲	۳۳
اردو نسل	۱۳	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵
نیا روس	۱۴	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333. 611128

صاحبِ معرفت

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیا اور کلام سے عاجز ہونا ایمان میں سے ہے۔ (الحیاء والعیّ من الایمان) بعض صوفیار کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ کی پہچان ہو جائے، اس کی زبان گویائی سے تھک جائے گی (من عرف اللہ کلّ لسانہ)

جس طرح خالی برتن زیادہ آواز دیتا ہے، اور جو برتن بھرا ہوا ہو اس میں آواز کم ہو جاتی ہے۔ کم پانی میں پتھر پھینکیں تو بہت زیادہ تموج ہوگا۔ مگر سمندر میں پتھر پھینکئے تو اس میں اس کی وجہ سے کوئی تموج نہیں ہوتا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ خالی انسان زیادہ بولتا ہے اور بھرا ہوا انسان ہمیشہ کم بولتا ہے۔

اللہ کی معرفت سب سے بڑی حقیقت کی معرفت ہے۔ آدمی جب اللہ کو اس کی انتہاء عظمتوں اور اس کے بے پایاں کمالات کے ساتھ پاتا ہے تو اپنا وجود اس کو بالکل حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اللہ سب کچھ ہے، اور اس کے مقابلہ میں میں کچھ نہیں ہوں۔ یہ احساسِ فروتنی اس کی زبان کو بند کر دیتا ہے۔ وہ حیرانی کی کیفیت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

مزید یہ کہ اللہ کی معرفت آدمی کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کے شعور کو جگاتی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہر ہر کام اور ہر ہر بول کا مجھے قادرِ مطلق کے سامنے حساب دینا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ناپ تول کر بولے۔ وہ کہنے سے پہلے سوچے اور اظہار سے پہلے احتساب کرے۔ خدا کی معرفت آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتی ہے، اور سنجیدگی، عین اپنے مزاج کے مطابق، آدمی کو خاموش کر دیتی ہے۔

خاموشی کوئی سلبی کیفیت نہیں، وہ عین ایجابی عمل ہے۔ خاموش آدمی یہ بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ گہرا آدمی ہے۔ وہ بلند تر حقیقتوں کو پائے ہوئے ہے۔ خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آدمی بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ کرنے سے پہلے اپنے کرنے کو تولتا ہے۔ خاموشی فرشتوں کے ساتھ مشابہت ہے۔ کیوں کہ فرشتے خاموش زبان میں بولتے ہیں۔ جس آدمی کو فرشتوں کی ہم نشینی حاصل ہو جائے، وہ خاموش زیادہ دکھائی دے گا اور بولتا ہوا کم۔

چیلنج نہ کہ خطرہ

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے میری ملاقات ایک ہندو ڈاکٹر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جب یہ کہا جائے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تو مسلمان بہت غصہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام اپنی سچائی کے زور پر پھیلا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اس جواب پر خود ہی یقین نہیں۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج کل کے مسلمان بات بات پر شور کرتے ہیں کہ "اسلام خطرہ میں ہے"۔

ہندو بھائی نے کہا کہ اسلام کی اصل طاقت اگر اس کا سچا مذہب ہونا ہے تو یہ طاقت تو اب بھی اس کے پاس پوری طرح موجود ہے، پھر اس کو خطرہ کیوں۔ مسلمانوں کا شور وغل ثابت کرتا ہے کہ اسلام کی اصل طاقت تلوار ہے۔ موجودہ زمانہ میں چوں کہ اسلام سے یہ طاقت چھن گئی ہے، اس لیے وہ خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ اگر اسلام کی اصل طاقت سچائی ہوتی تو اس کے خطرہ میں پڑنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ کیوں کہ کسی کے پاس اگر سچائی ہے تو وہ ہمیشہ اس کو حاصل رہے گی۔ سچائی ایسی چیز نہیں جس کو کوئی شخص کسی سے چھین سکے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک نظریہ ہے۔ کسی نظریہ کے لیے خطرہ کی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ نظریاتی طور پر غلط ثابت ہو جائے۔ اسلام نظریاتی طور پر غلط ثابت نہیں ہوا۔ وہ اپنی نظریاتی صداقت کو مسلسل طور پر تاریخ میں باقی رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے اسلام کو کوئی خطرہ بھی نہیں۔

البتہ اسلام کو چیلنج پیش آتے ہیں اور وہ پیش آتے رہیں گے۔ ماضی میں اسلام کو چیلنج پیش آئے۔ مثال کے طور پر، عباسی دور میں فکر یونانی کا چیلنج۔ اس وقت کسی نے "اسلام خطرہ میں" کا نعرہ نہیں لگایا۔ بلکہ علمی سطح پر چیلنج کا جواب دیا۔ موجودہ زمانہ میں بھی اسی طرح اسلام کو فکری چیلنج پیش آئے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان جدید چیلنج کا جواب دینے کے لیے نااہل تھے۔ اس لیے وہ "اسلام خطرہ میں" کا نعرہ لے کر کھڑے ہو گیے۔ موجودہ صورت حال مسلم رہنماؤں کی رہنمایانہ حیثیت کے لیے خطرہ تھی۔ مگر انھوں نے اپنی حیثیت کو بچانے کے لیے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔

ترک فاتح

ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا جو اب استانبول کہا جاتا ہے۔ یہ مسیحی دنیا کے لیے سب سے زیادہ ہلا دینے والا واقعہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک یونانی کتبہ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعہ نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا :

There has never been and there never will be
a more dreadful happening (p. 336).

حضرت عثمان کی خلافت (۶۵۶ - ۶۴۴ء) کے زمانہ میں مسلمان ترکی میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں انھوں نے ترک علاقہ میں مزید پیش قدمی کی۔ مگر اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ انتہائی محفوظ جغرافیہ اور بے حد مضبوط قلعہ کی بنا پر اتنا مستحکم تھا کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس کو مسخر نہ کر سکے۔ اس کی تسخیر ۸۰۰ سال بعد صرف ۱۴۵۳ میں ممکن ہو سکی۔

ترکی کا عثمانی سلطان محمد دوم جو محمد فاتح کے نام سے مشہور ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طویل مہم کو کامیابی تک پہنچایا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہایت گہرا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمد ۱۴۵۱ میں تخت پر بیٹھا جو اس وقت ادرنہ (Edirne) میں تھا۔ اس نے خاموش اور مسلسل عمل کے ذریعہ تمام ممکن سیاسی اور فوجی تدبیریں اس مقصد کے لیے مہیا کیں۔

۱۴۵۲ کا پورا سال اس نے باسفورس کے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے میں صرف کیا جہاں سے جنگی کارروائیوں کو منظم کیا جا سکے۔ یہ قلعہ بعد کو قلعہ رومیل (Rameli Hisari) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۳۱ جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا تیار کروایا تاکہ سمندر کے راستہ سے موثر حملہ کیا جا سکے۔ اس نے ہنگری کے ایک استاد اربان (Urban) کو بلا کر اتنی بڑی توپ تیار کرائی جو اس وقت کے یورپ میں ایک نادر چیز تھی۔ یہ توپ سازی بے حد اہم تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ قسطنطنیہ کی مضبوط سنگی فصیل توڑی جا سکی۔

اس قسم کی مختلف ضروری تیاریوں کے علاوہ اس نے مزید یہ کیا کہ بوقت جنگ یونان اور ہنگری کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے ان سے امن معاہدے کیے جن کی شرائط یک طرفہ طور پر ان کے مفاد میں تھیں :

To keep Venice and Hungary neutral, he signed peace treaties favourable to them (11/860).

یہ عین وہی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار فرمائی، اور جس کے ذریعہ آپ نے مکہ کے قریش کو خیبر کے یہودیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش اس کے پابند ہو گئے تھے کہ بوقت جنگ وہ یہود کی مدد نہیں کریں گے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد سلطان محمد خاموش نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس نے جنگی کارروائی کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پوری مہم کے دوران وہ بذات خود اس میں شریک رہا۔ قسطنطنیہ کی مہم کی تیاری اور اس کی کارروائیوں کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس زبردست منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کا آخری تاجدار قسطنطین (Constantine XI) جنگ کرتا ہوا شہر کے دروازے پر مارا گیا۔ ترکی میں مسلمانوں کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس فتح کے بعد ترکی کی راجدھانی ادرنہ (ایڈریانوپل) کے بجائے قسطنطنیہ قرار پائی اور آج تک وہ وہیں قائم ہے۔ اب اس کا نام استانبول ہے۔ قسطنطنیہ گیارہ سو سال سے زیادہ مدت تک مسیحی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم سلطنت کی راجدھانی بنا۔ تقریباً پانچ سو سال تک وہ عظیم عثمانی خلافت کی راجدھانی اور پورے عالم اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بار صرف جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴) میں ختم ہوئی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳) تک اسلامی تاریخ کے تمام بڑے بڑے فاتحانہ واقعات گہری حکمت اور عظیم منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ مسلمان تدبیر اور منصوبہ بندی کے بغیر محض جوش و خروش کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر بالاکوٹ مارچ (۱۸۳۱) سے لے کر اجودھیا مارچ (۱۹۸۹) تک ان کے تمام اقدامات صرف ناکامی پر ختم ہو رہے ہیں۔

بددعا نہیں

قال الامام احمد حدثنا ابوالنضر حدثنا ابوعقیل حدثنا عمرو بن حمزۃ عن سالم عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول : اللّٰھم العن فلانا وفلانا، اللّٰھم العن الحارث بن ھشام اللّٰھم العن سھیل بن عمرو اللّٰھم العن صفوان بن امیۃ۔ فنزلت الآیۃ (لیس لك من الامر شیئ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون) فتیب علیھم کلھم۔ وقال احمد حدثنا ابومعاویۃ العلائی حدثنا خالد بن الحارث حدثنا محمد بن عجلان عن نافع عن عبداللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو علی اربعۃ فانزل اللہ (لیس لك من الامر شیئ) قال وھداھم اللہ للاسلام (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۲)

ترجمہ : امام احمد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ میں) یہ کہتے تھے کہ اے اللہ، فلاں اور فلاں پر لعنت کر، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر، اے اللہ، سہیل بن عمرو پر لعنت کر، اے اللہ، صفوان بن امیہ پر لعنت کر، تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا، کیوں کہ وہ ظالم ہیں (آل عمران ۱۲۸) پھر ان سب کو توبہ کی توفیق ملی (اور وہ ایمان لائے) امام احمد نے ایک اور روایت اس طرح نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مشرکوں میں سے) چار آدمیوں کے خلاف بددعا کرتے تھے تو اللہ نے یہ آیت اتاری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ نے ان چاروں آدمیوں کو اسلام کے ذریعہ ہدایت دی۔

اس حدیث میں جن کافروں اور مشرکوں کا ذکر ہے، انھوں نے خود قرآن کے بیان کے مطابق "ظلم" کا ارتکاب کیا تھا۔ ان کی برائی اتنی واضح تھی کہ خود پیغمبر اسلام کی زبان سے ان کے خلاف لعنت اور بددعا کے کلمات نکلنے لگے۔ اس کے باوجود نہ صرف ایسا ہوا کہ ان کے خلاف لعنت اور بددعا سے روک دیا گیا بلکہ ان سب کے اندر آخر کار نیا ذہن ابھرا، اور ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔

زندہ لوگ

مسٹر ایڈون رین گولڈ (Edwin M. Reingold) ایک سینیر امریکی جرنلسٹ ہیں۔ وہ ۱۹۶۹ میں ٹائم میگزین کے ٹوکیو بیورو کے چیف مقرر ہوئے۔ اس طرح وہ پچھلے ۲۰ سال سے جاپان اور جاپانیوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔

مسٹر رین گولڈ نے اپنے ۲۰ سالہ تجربہ کی روشنی میں جاپان کے بارہ میں ایک مضمون لکھا ہے جو ٹائم (۵ جون ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ جاپانی اگرچہ بظاہر جامد قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ ایک چیز کے بارہ میں طے کرلیں کہ وہ ان کے لیے مفید ہے تو اس کے بعد وہ نہایت تیزی سے متحرک ہوسکتے ہیں :

Even though the Japanese appear to be quite rigid, they can move quickly once they've decided it's to their advantage (p. 5).

یہی زندہ قوم کی سب سے زیادہ یقینی پہچان ہے۔ زندہ انسان کے لیے ماننے اور کرنے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ زندہ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان پر کسی اصول کی صداقت واضح ہوجائے تو عین اسی وقت وہ اس کے لیے پوری طرح متحرک ہوجاتے ہیں۔ وہ جس چیز کا اقرار کرتے ہیں اسی پر عمل کرتے ہیں۔ اور جس چیز پر عمل کرتے ہیں وہ وہی ہوتی ہے جس کا وہ اقرار کرچکے ہیں۔

یہی صلاحیت مومن کے اندر کمال درجہ میں ہوتی ہے۔ عام انسان کو اس کا مفاد متحرک کرتا ہے۔ مومن کو حرکت میں لانے کے لیے یہ کافی ہے کہ کسی چیز کی صداقت اس کے اوپر واضح ہوجائے۔ مومن اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ ایک بات جو دلیل سے برحق ثابت ہوگئی ہو، اس کے لیے وہ حرکت میں نہ آئے۔ وہ اپنی زندگی اس کے لیے وقف نہ کردے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس صفت کا کامل ترین نمونہ ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب دلیل سے ان کے اوپر حق واضح ہوگیا تو انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کردی۔ ان کی راہ میں دشواریاں آئیں۔ طرح طرح کے اونچ نیچ ان کے لیے رکاوٹ بنے۔ مگر وہ متزلزل نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ اسی راہ میں اپنی جان دیدی۔

ایک مثال

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں انسانی حقوق پر (Human Rights) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ حقوق انسانی کا تصور اگرچہ قدیم زمانہ سے شاعروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں کے یہاں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر عملی صورت میں وہ صرف اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ (8/1183)

ایک شخص اگر صرف اس مقالہ کو پڑھے، اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکے تو وہ اس موضوع کے بارے میں سخت ترین غلط فہمی کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا انقلاب، مغربی تہذیب کے ظہور سے ہزار سال پہلے، عرب میں اپنی کامل ترین صورت میں واقعہ بن چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں حقوقِ انسانی کی بحالی خود اسی اسلامی انقلاب کا نتیجہ اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا واقعہ ہے۔

خود مغربی علماء میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کھلے طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف ایچ جی ویلز (۱۹۴۶-۱۸۶۶) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا پہلا پیراگراف اہل اسلام کے درمیان مال اور خون کے تمام جھگڑے کو کالعدم کر رہا ہے۔ اس کا آخری حصہ ایک کالے حبشی کو خلیفہ کے برابر کا درجہ دے رہا ہے۔ انھوں نے دنیا میں باوقار اور منصفانہ معاملہ کی عظیم روایت قائم کی۔ انھوں نے لوگوں میں فیاضی کی روح پھونکی۔ انھوں نے ایک ایسا سماج بنایا جو تاریخ کے کسی بھی پچھلے سماج سے زیادہ بے رحمی اور اجتماعی ظلم سے پاک تھا:

The reader will note that the first paragraph sweeps away all plunder and blood feuds among the followers of Islam. The last makes the believing Negro the equal of the Caliph... they established in the world a great tradition of dignified fair dealing, they breathed a spirit of generosity, and they are human and workable. They created a society more free from widespread cruelty and social oppression than any society had ever been in the world before.

H.G. Wells, *The Outline of History*, London 1963, p. 606.

اس دنیا میں حقیقت سے انکار کی مثالیں ہیں اور اسی کے ساتھ حقیقت کے اعتراف کی مثالیں بھی۔

مہنگی قیمت

۱۱ مئی ۱۹۸۹ کو محمد نظیر امام الدین صاحب (۷۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ دھولیہ (مہاراشٹر) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے دھولیہ میں ہونے والے ایک فرقہ وارانہ فساد کی تفصیل بتائی۔ جو مارچ ۱۹۸۹ میں ہوا تھا۔

دھولیہ میں مچھلی بازار کی مسجد کے سامنے پانی کا نل لگا ہوا ہے۔ یہ نل مسجد کا ہے، تاہم عام لوگ بھی اس سے پانی بھرتے ہیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۹ کو ہولی کا دن تھا۔ کچھ ہندو نوجوان ایک ٹینکر لے کر آئے اور اس نل سے پانی بھرنے لگے۔ ایک ٹینکر وہ بھر کر لے گیے۔ اس کے بعد وہ دوسرا ٹینکر لے کر آئے اور دوبارہ اس نل سے پانی بھرنا شروع کیا۔ ان میں سے کسی نے مسجد کی دیواروں پر پانی پھینک دیا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی جس سے پانی اندر تک چلا گیا۔ مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ ابھی تک تو آپ ٹینکر بھر رہے تھے، اب آپ مسجد پر ہولی کا پانی بھی ڈال رہے ہیں۔

پہلے دونوں کے درمیان لفظی تکرار ہوئی۔ اس کے بعد ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ شور وغل سن کر دونوں فرقہ کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوگیے۔ اب باقاعدہ لڑائی ہونے لگی۔ آخر میں پولیس آئی۔ اس نے فائرنگ کی۔ اس فائرنگ میں دو مسلمان مر گیے۔ تقریباً دس مسلمان زخمی ہو کر اسپتال میں پہونچائے گیے۔ ۸۰ مسلمانوں پر مقدمہ قائم ہوا جو اب تک جاری ہے۔

میں نے محمد نظیر امام الدین صاحب سے کہا کہ ہولی کے دن ہندو لوگ اکثر شراب اور بھنگ کے نشے میں ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے الجھنا ہرگز عقل مندی کی بات نہیں۔ مسلمانوں کو اگر مسجد پر پانی پھینکنے یا دو ٹینکر بھرنے پر اعتراض تھا تو وہ خوش تدبیری سے بھی اس کا حل نکال سکتے تھے۔ ایسے موقع پر مشتعل ہو کر لڑائی چھیڑ دینا کسی طرح بھی دانش مندی نہیں۔

میں نے کہا کہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ عقلمندی نہ تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دو ٹینکر بھرے جانے پر صبر کر لیں تاکہ دو مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں۔ وہ دیوار پر پانی یا رنگ چھڑکنے کو برداشت کر لیں تاکہ سڑک پر ان کا خون نہ چھڑکا جائے۔ محمد نظیر امام الدین صاحب نے میری رائے سے پورا اتفاق کیا۔

چُپ کی طاقت

پرانا مثل ہے کہ "ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے" یہ بہت بامعنی ہے اور طویل انسانی تجربہ پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بذاتِ خود ایک طاقت ور ہتھیار ہے، بشرطیکہ اس ہتھیار کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

غالباً ۱۹۶۶ کی بات ہے۔ میں لکھنؤ اور شاہ گنج کے درمیان ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ یہ دہرہ دون اکسپرس تھی اور میں پرانے نام کے مطابق تھرڈ کلاس اور نئے نام کے مطابق سکنڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں تھا۔ پورے ڈبہ میں بظاہر میں اکیلا مسلمان تھا۔

سفر کے درمیان ایسا ہوا کہ مجھے ٹائلٹ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر ڈبہ کے ٹائیلٹ کے پاس گیا۔ میں نے حسبِ عادت دروازہ آہستگی سے کھولا۔ مگر دروازہ ذرا سا کھلا تھا کہ اندر سے کپڑے کی صورت دکھائی دی۔ میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ ٹائیلٹ کے اندر ایک ہندو خاتون موجود تھیں۔ مگر انھوں نے قاعدہ کے مطابق دروازہ کا بولٹ نہیں لگایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دروازہ کسی قدر کھل گیا۔

عورت کا ہندو شوہر میرے قریب کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی وہ بگڑ گیا۔ وہ غصہ اور نفرت سے بھر کر میرے اوپر پل پڑا۔ وہ جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بری طرح ڈانٹنا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور مجھ کو معلوم نہ تھا کہ اندر کوئی ہے، ورنہ ہرگز میں دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر میری وضاحت کا ہر لفظ اس کو اور زیادہ برہم کر رہا تھا۔ حتی کہ بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھے کھڑکی کے راستہ سے باہر پھینک دے گا۔

لمبی بوگی پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ مگر سارے ڈبہ میں کوئی ایک شخص بھی میری حمایت کے لیے نہیں اٹھا۔ آخر میں میں بالکل خاموش ہو گیا۔ میں مذکورہ شخص کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میرے چہرے پر خوف یا اشتعال کا ذرا سا بھی کوئی اثر نہ تھا۔ میں انتہائی غیر جذباتی انداز میں اسٹیچو کی طرح خاموشی کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اب وہ ٹھنڈا پڑنے لگا، یہاں تک کہ بالکل چپ ہو گیا۔ دوسرے کو چپ کرنے کی سب سے آسان تدبیر صرف ایک ہے ـــــ اپنی زبان کو یک طرفہ طور پر بند کر لینا۔

بے بصیرت، بابصیرت

دن اور رات کا فرق اس شخص کے لیے ہے جو بینا ہو۔ جو شخص بینا نہ ہو اس کے لیے دن اور رات کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اس کے لیے دن بھی ویسا ہی ہے جیسے رات۔ اس کے لیے زندگی تاریکیوں کا ایک اتھاہ سمندر ہے جہاں کوئی اجالا نہیں۔ اس کے لیے دنیا ایک لامحدود تاریک خلا ہے جس میں روشنی کی کوئی کرن نہیں۔

یہی حال معانی کے اعتبار سے اس انسان کا ہے جو بصیرت سے خالی ہو۔ ایسے انسان کے لیے حق اور ناحق میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے نزدیک سچ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا جھوٹ۔ اس کے لیے ظلم بھی ویسا ہی ہوگا جیسے انصاف۔ اس کے لیے غصب اور خیانت کے کام بھی ویسے ہی ہوں گے جیسے حق پرستی اور دیانت داری۔

بے بصیرت اور بابصیرت انسان کے درمیان اس سے بھی زیادہ بڑا فرق وہ ہے جو حقائق کے فہم کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ بصیرت والے آدمی کے اندر ایک قوت تمیز زندہ ہوتی ہے جو سچائی کو سچائی کے روپ میں اور جھوٹ کو جھوٹ کے روپ میں دکھاتی ہے۔ اس کا کلام سطحیت اور تضاد اور ظاہری لفاظی سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ لگتی ہوئی بات کہتا ہے۔ اس کی زبان حقیقت کے مطابق کھلتی ہے۔ وہ وہی بات کہتا ہے جو کہنا چاہیے، اور وہ بات نہیں کہتا جو از روئے حقیقت کہنے والی بات نہیں۔

اس کے برعکس جو آدمی بے بصیرت ہو، اس کی سمجھ اندھیروں میں بھٹکنے والی سمجھ ہوتی ہے۔ وہ کبھی کچھ کہتا ہے اور کبھی کچھ۔ اس کا کلام سطحیت اور متضاد باتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کی باتیں معانی سے خالی اور الفاظ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کا کلام مطابق واقعہ کلام نہیں ہوتا۔ اس کا بیان صحتِ رائے سے خالی ہوتا ہے۔

آپ ایک بینا آدمی کو دیکھیں تو اس کے چہرے پر رونق دکھائی دے گی۔ اس کے برعکس نابینا آدمی کے چہرے پر ایک قسم کی بے رونقی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی حال بے بصیرت کلام اور بابصیرت کلام کا ہے۔ ایک صاحب ذوق آدمی چند جملے سن کر یا چند سطریں پڑھ کر یہ جان لیتا ہے کہ صاحبِ کلام بے بصیرت انسان ہے یا بابصیرت انسان۔

قومی توہین

مسجد کے سامنے سے ہندوؤں کا جلوس گزرے تو مسلمان فوراً اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر اسی مسجد کے سامنے سے مسلمانوں کا شادی کا جلوس گزرے تو کوئی مسلمان اس کو روکنے کے لیے نہیں اٹھتا۔ کوئی ہندو اگر مسجد کے اندر ٹرانسسٹر بجائے تو مسلمان اتنا مشتعل ہوں گے کہ پوری بستی میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اسی مسجد میں اگر مسلمان ٹرانسسٹر بجائے تو کسی مسلمان کو غصہ نہیں آتا۔ کوئی ہندو مسجد میں بت رکھ دے تو فوراً ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ مگر مسلمان بزرگوں کی درگاہوں میں ان کی قبر کو بت بنا کر پوجتے ہیں اور اس پر کوئی شور نہیں مچتا۔

ایک ہی قسم کے دو واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ مسلمان ایک ہندو کے جس فعل پر بھڑکتے ہیں، وہی فعل ایک مسلمان کرے تو وہ نہیں بھڑکتے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی خود ساختہ قومی شریعت ہے نہ کہ خدا کی دی ہوئی اسلامی شریعت۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اپنی پڑوسی قوم کے ساتھ پچھلی نصف صدی سے رقابت (Rivalry) قائم کر رکھی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا واقعہ دیکھتے ہیں جس میں ان کے خیال کے مطابق، ہندو قوم، مسلم قوم کی بڑائی کو پامال کر رہی ہو تو وہ اس میں اپنی قومی توہین محسوس کرتے ہیں اور قومی جذبہ کے تحت بھڑک اٹھتے ہیں اور فریق ثانی سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں نے بطور خود ان چیزوں کو ملی غیرت یا اسلامی غیرت کا نام دے رکھا ہے۔ مگر یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ ایک جھوٹے قومی عمل کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرنا ہے۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا ہر فعل اللہ کی نظر میں صرف ان کے وِزر کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو انعام کا مستحق نہیں بناتا۔

اس قسم کا لڑائی جھگڑا کرنے والے اگرچہ ہمیشہ عوام ہوتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے رہنما بھی اس معاملہ میں یکساں طور پر مجرم ہیں۔ کیوں کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں، مسلم رہنما کبھی ان کی مذمت نہیں کرتے۔ اس طرح عوام اگر براہ راست طور پر اس کے ذمہ دار ہیں تو خواص اور رہنما بالواسطہ طور پر۔ اور قرآن وحدیث کے مطابق، اس طرح کے معاملہ میں بالواسطہ شرکت بھی اتنی ہی بری ہے جتنی براہِ راست شرکت۔

اردو نسل

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ ۱۹۸۹) میں ایک باتصویر خبر چھپی ہے۔ یہ مسٹر موہن سروپ ملک کے بارے میں ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ وہ ٹائمس آف انڈیا کے ایک اسٹاف رپورٹر تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۹ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے سینٹ اسٹیفنس کالج سے انگلش میں بی اے کیا۔ بمبئی سے انھوں نے جرنلزم کا ڈپلوما حاصل کیا۔ وہ انگلش، پنجابی، ہندی، اردو اور جرمن بخوبی طور پر جانتے تھے:

He graduated in English from St. Stephen's College, Delhi, and also obtained a diploma in journalism from the Bombay College of Journalism. He was well-versed in English, Punjabi, Hindi, Urdu and German.

موہن سروپ ملک کی اس نسل کے ایک فرد تھے جو ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں تیار ہوئی۔ اس زمانہ کے تعلیم یافتہ لوگ عام طور پر اردو زبان جانتے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہی لوگ ہندستان کے مختلف شعبوں کے انچارج بنے۔ مزید یہ کہ تقسیم کے نتیجہ میں جو لوگ پاکستان کو چھوڑ کر ہندستان آئے وہ بھی سب کے سب اُردو داں تھے۔

یہی "اُردو داں" لوگ تھے جو آزاد ہندستان کے مختلف شعبوں کے انچارج بنے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے لے کر ایک اخباری رپورٹر اور پٹواری تک بیشتر لوگ وہی تھے جو بخوبی طور پر اردو جانتے تھے۔ تقسیم کے بعد کے ہندستان میں یہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم الشان سرمایہ تھا۔ مگر وہ اس سرمایہ کو ایک فیصد بھی استعمال نہ کر سکے، یہاں تک کہ ملک میں وہ دوسری نسل اوپر آگئی جو اردو سے نابلد تھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ انھیں امکانات نظر نہیں آتے۔ وہ کھوئی ہوئی چیز کی بابت تو خوب جانتے ہیں، مگر جو چیز کھوئی نہیں گئی ہے، جو اب بھی امکانی طور پر انھیں حاصل ہے، اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بربادی کی کم از کم ایک وجہ یقیناً یہی ہے۔

نیا روس

اے پی کی ایک خبر ٹائمس آف انڈیا (۱۶ مارچ ۱۹۸۹، سکشن ۲) کے صفحہ اول پر چھپی ہے۔ اس کے مطابق تاشقند (سوویت روس) میں خلاف معمول مسلمانوں کا ایک جلوس نکلا۔ آنسوؤں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کئی ہزار مسلمانوں نے ۱۴ مارچ ۱۹۸۹ کے ساتویں صدی عیسوی کے قرآنی نسخہ کی واپسی پر خوشی منائی اور اس کا خیر مقدم کیا۔ سرکاری طور پر ملحد روس میں اس قسم کا مذہبی جوش شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ یہ قرآنی نسخہ وہ ہے جس کو حضرت عثمان نے تیار کرایا تھا۔ کئی سو سال پہلے یہ نسخہ روس کے شہنشاہ زار کو ملا۔ وہ ان کی راجدھانی سینٹ پیٹرس برگ میں محفوظ رہا۔ ۱۹۱۷ کے بالشویک انقلاب کے بعد وہ تاشقند کے سرکاری میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ قرآن کا یہ نسخہ اب تک الماریوں میں بند تھا۔ اب اس کو عوامی زیارت کے لیے کھول دیا گیا ہے (صفحہ ۱۱)

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ نئے روسی حکمراں گورباچوف کے بعد کس طرح اشتراکی روس میں مذہبی امور کے لیے نئے آزاد مواقع کھل گیے ہیں۔ روس میں اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) کے بعد سے پورے ستر سال تک وہاں مذہبی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اوپری پابندیوں کے نیچے لوگوں کے دلوں میں اور ان کے گھروں میں مذہب بدستور زندہ رہا۔ یہاں تک کہ خود روس کے اشتراکی حکمرانوں کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مذہب سے لڑنا حقیقت واقعہ سے لڑنا ہے۔ اس طرح کی لڑائی میں حقیقت واقعہ تو نہیں بدلتی البتہ لڑنے والے کے حصہ میں بے فائدہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کے معاملہ میں اپنی پالیسی بدل دی۔

تاہم روسی مسلمان ان نئے مواقع سے صرف اس وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ وہ حکمت اور تدبر کے ساتھ اس کو استعمال کریں۔ اگر انھوں نے غیر حکیمانہ اور غیر دانشمندانہ انداز اختیار کیا تو مواقع بدستور موجود ہوں گے مگر مسلمان اس کا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

ہر آزادی محدود آزادی ہے۔ خواہ اشتراکی ملک ہو یا جمہوری ملک، خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ہر نظام اپنے شہریوں کو محدود آزادی ہی دیتا ہے۔ جو لوگ اس راز کو جانیں، وہ ہر جگہ کامیاب رہیں گے اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہر جگہ ناکام۔

آدھا حل

واشنگٹن میں مختلف انتظامی اور تجارتی شعبوں کے ماہرین کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں پورے امریکہ سے ۲۳ ٹاپ کے افراد شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک جیمز ہاروے (James Harvey) تھے جو ٹرانس امریکہ کارپوریشن (Transamerica Corp.) کے چیرمین ہیں۔ جیمز ہاروے نے امریکہ کے بعض اہم داخلی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا پہلا کام مسئلہ کی اصل نوعیت کو جاننا ہے۔ تجارت میں آدھا حل سادہ طور پر یہ ہے کہ آپ مسئلہ کو جان لیں۔

In business, half the solution is simply knowing the problem.

ٹائم میگزین (یکم مئی ۱۹۸۹) کے صفحہ ۵ پر میں نے یہ قول پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ کہنے والے نے اس چھوٹے سے جملہ میں بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یقیناً مسئلہ کے حل کی طرف کامیاب پیش قدمی کا پہلا زینہ یہ ہے کہ آپ مسئلہ کو صحیح طور پر جان لیں۔ اگر آپ مسئلہ کو صحیح طور پر نہ جانیں تو آپ غیر متعلق راہوں میں دوڑنا شروع کر دیں گے۔ اور غیر متعلق راہوں میں دوڑنا صرف اپنی کوششوں کو ضائع کرنا ہے نہ کہ حل کی کوشش کرنا۔ غلط جدوجہد اس دنیا میں کبھی کسی حقیقی انجام تک نہیں پہونچتی۔

ہندستان کی سروسوں میں مسلمانوں کو کم جگہ ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح اعلیٰ سائنسی اداروں میں وہ داخلہ نہیں پاتے۔ مسلم رہنما تعصب کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے تقریباً ۵۰ سال سے وہ تعصب کے خلاف لفظی طوفان برپا کیے ہوئے ہیں مگر اس لمبی جدوجہد کا ایک فی صد بھی کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہ مل سکا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلم رہنماؤں نے مسئلہ کی نوعیت ہی کو نہیں جانا۔ پھر وہ اس کا حل نکالنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

یہ مسئلہ جو موجودہ مسلمانوں کو درپیش ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اپنے رہنماؤں کی نادان رہنمائی کی بنا پر وہ تعلیم میں پیچھے ہو گیے۔ سروسوں اور داخلوں میں ان کے پیچھے ہونے کا یہی واحد سبب ہے۔ اب اس مسئلہ کا آدھا حل یہ ہے کہ وہ اس راز کو جان لیں اور پھر تعلیمی میدان میں اپنی محنت شروع کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو صرف دس سالہ عمل کے ذریعہ وہ مسئلہ حل ہو جائے گا جو غلط رُخ پر ۵۰ سالہ چیخ پکار کے باوجود حل نہ ہو سکا۔

جھوٹی توجیہہ

کمیونسٹ ملکوں میں اس وقت جو سماج بنا ہے، اس میں کچھ لوگ خوش حال ہیں اور کچھ لوگ بدحال۔ کچھ لوگوں کی آمدنی بہت زیادہ ہے اور کچھ لوگوں کی آمدنی بہت کم۔ یہ عین وہی صورت حال ہے جو بدنام سرمایہ دار ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ ملکوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اس صورت حال پر تنقید کی اور کہا کہ ساری قربانیوں کے بعد ہم نے جو کچھ پایا وہ کمتر شکل میں عین وہی ہے جو سرمایہ دار ملکوں میں پہلے سے موجود ہے۔

اس کے جواب میں کمیونسٹ چین میں ایک نیا نعرہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس چینی نعرہ کا ترجمہ یہ ہے کہ عوامی خوش حالی کا مطلب یہ نہیں کہ سب لوگ ایک ہی وقت میں یکساں طور پر خوش حال ہوں:

Common prosperity does not mean simultaneous prosperity.

انسان اپنی غلطی کی توجیہہ کرنے میں کتنا زیادہ ذہین ہے، مگر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے وہ کتنا زیادہ بیوقوف بن جاتا ہے۔ ایک معاملہ میں وہ حد درجہ ذہین ہے، اور دوسرے معاملہ میں حد درجہ بیوقوف۔

یہی موجودہ دنیا کے بیشتر انسانوں کا حال ہے۔ وہ ایک اقدام کرتے ہیں۔ بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ ان کا اقدام غلط تھا۔ مگر وہ سیدھی طرح اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے اقدام کو درست ظاہر کرنے کے لیے ایک جھوٹی توجیہہ تلاش کر لیتے ہیں۔ بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو صحیح ثابت کر لیا۔ حالاں کہ ایسی ہر توجیہہ صرف آدمی کی غلط کاری میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ اس کو غلط کار سے آگے بڑھا کر سرکش اور ظالم کے مقام پر پہونچا دیتی ہے۔

غلطی کو چھپانا، ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا ہے۔ ایسے آدمی سے پوچھا جائے گا کہ جب تم نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے الفاظ پالئے تو اپنی غلطی کے اعتراف کے لیے تم نے الفاظ کیوں نہیں پائے۔

حل کی طرف

ہندستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک کتاب لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو مسٹر ایم جے اکبر نے مرتب کیا ہے اور وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے :

M.J. Akbar, *Nehru: The Making of India*, 1988

اس کتاب میں نہرو کی زندگی سے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔ اس کے باب ۴۷ میں مولف نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۷ کے الکشن کے بعد جب کیرالا میں کمیونسٹ پارٹی نے وزارت بنائی تو نئی دہلی کی ایک مجلس میں اس کا ذکر آیا۔ ایک ہال میں حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ نہرو بحیثیت وزیر اعظم شریک تھے۔ گفتگو کے دوران مسٹر وائی ڈی گنڈیویا نے کہا کہ جناب، کیرالا میں کمیونسٹوں نے اپنی حکومت بنالی ہے۔ اگر وہ کل کے الکشن میں دوبارہ جیت جائیں اور دہلی کی حکومت پر قبضہ کرلیں تو اس کے بعد مرکز کا کیا حال ہوگا۔

نہرو نے جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر سوچا اور پھر بولے "کمیونسٹ، کمیونسٹ، کمیونسٹ، آخر آپ لوگ کمیونسٹوں سے اور کمیونزم سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں۔ آپ کیوں ایسا سوچتے ہیں کہ کمیونسٹ مرکز میں اقتدار حاصل کرلیں گے۔" اس کے بعد نہرو دوبارہ چپ ہوگیے۔ پھر رک رک کر اور اعتماد کے لہجہ میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "ہندستان کے لیے خطرہ، اچھی طرح جان لیجئے، کمیونزم نہیں، یہ دائیں بازو کی ہندو فرقہ پرستی ہے :

The danger to India, mark you, is not Communism.
It is Hindu right-wing communalism (p. 580).

مسٹر گنڈیویا جنھوں نے اپنی کتاب Outside the Archives میں یہ واقعہ لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نہرو نے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اپنے مذکورہ جملہ کو کئی بار دہرایا۔

جواہر لال نہرو کو مہاتما گاندھی نے اپنا سیاسی جانشین (Political successor) کہا تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد وہ ہندستان کے وزیر اعظم بن گیے۔ تاہم جواہر لال اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک نرم آدمی تھے۔ دوسری طرف کیبنٹ میں ان کے رفیق سردار پٹیل ایک آہنی انسان کہے جاتے

تھے۔ سردار پٹیل مزاجاً سخت متعصب تھے، اسی کے ساتھ مرکزی حکومت میں امور داخلہ کا شعبہ ان کے پاس تھا۔

آزادی (۱۹۴۷) کے فوراً پہلے اور اس کے بعد ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ ان کو دبانے کی اصل ذمہ داری سردار پٹیل کی تھی۔ مگر انھوں نے اس معاملہ میں ڈھیل دینے کی پالیسی اختیار کی۔ جواہر لال نہرو کو اس مسئلہ پر سردار پٹیل سے سخت اختلاف تھا۔ بدرالدین طیب جی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اگر نہرو نے اس معاملہ میں اس وقت مضبوط موقف اختیار کیا ہوتا، وہ سردار پٹیل کی مخالفت کرتے جب کہ ابھی مہاتما گاندھی زندہ تھے تو ہندستان کی سیاست کا رخ بالکل دوسرا ہوتا:

If he had taken a stand then, opposing Sardar Patel while Gandhi was still alive, Indian politics would have taken quite a different turn.
Badruddin Tayabji, *Memoirs of An Egoist,* vol. I, p. 186.

میرے نزدیک یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ نہرو ایک طرف آزاد ہندستان کے مسائل رکھتے تھے جن سے نمٹنے کے لیے انھیں ایک سخت ہاتھ کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر ۵۰۰ دیسی ریاستوں کا مسئلہ، اس کو سردار پٹیل کے سخت ہاتھ نے جس طرح حل کیا، غالباً نہرو کے لیے اس طرح اس کا حل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ پٹیل کسی ایک شخص کا نام نہ تھا، وہ دراصل ہندو فرقہ پرستی کے پورے گروپ کی علامت تھا۔ یہ گروپ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے اسی سوال پر خود گاندھی کو قتل کر دیا۔ پھر نہرو کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اس پر قابو پا لیتے۔

کسی دوسرے کی کمزوری سے زیادہ یہ خود ہندو فرقہ پرستی کی طاقت تھی جس نے نہرو کو دبا لیا۔ اسی نے مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ راج گوپال اچاری کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اکشے برہم چاری جیسے کتنے منصف مزاج ہندوؤں کو عاجز کر کے چھوڑ دیا۔ وغیرہ

نہرو نے جس خطرہ کی نشاندہی کی تھی، وہ آج ایک واقعہ بن چکا ہے۔ آج ہندو فرقہ پرستی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھی ہے اور اپنے بھیانک نتائج دکھا رہی ہے۔ آج بھی ہندوؤں میں ایسے ہوش مند اور انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھا رہے

ہیں۔ اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے برابر اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک مثال کا ذکر کرتے ہیں۔

مشہور ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ (۶ نومبر ۱۹۸۸) میں مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو ہر محب وطن کے لیے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان اس پورے انٹرویو کا خلاصہ ہے :

پرتی کریا میں جنما جاگرن پیچھے ڈھکیلتا ہے

یعنی ردّ عمل کے ذریعہ جو بیداری آئے، وہ قوم وملک کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتی ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں بہت سے لوگ مسلمانوں کی رد عمل کی تحریکوں کو صحوہ اسلامیہ کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں بہت سے خوش فہم لوگ ہیں جو ہندوؤں کے درمیان مسلم ردّ عمل کے تحت اٹھنے والی لہر کو "ہندو بیداری" کا نام دے رہے ہیں۔ مسٹر باجپئی نے ایسے ہندوؤں کو آگاہی دی ہے کہ یہ ایک منفی بیداری ہے، اور منفی بیداری ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتی ہے، وہ تعمیر کا سبب نہیں بنتی۔

کوئی شخص خواہ کتنے ہی بڑے سیاسی عہدہ پر ہو، اس کو کبھی بے قید اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ جنرل محمد ضیاء الحق ساڑھے گیارہ سال (۸۸ - ۱۹۷۷) تک پاکستان کے مطلق حکمراں رہے۔ مگر پاکستان کی جو طاقتیں ملک کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہیں، ان میں سے کسی ایک پر بھی وہ ہاتھ نہ ڈال سکے ——— مثلاً بڑے بڑے جاگیردار، اسمگلر، منشیات اور ہتھیاروں کا کاروبار کرنے والے، بیوروکریسی، رشوت لینے اور دینے والے، ٹیکس کی چوری کرنے والے، علٰحدگی پسند سیاست داں، وغیرہ

میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی وزیر یا حکمراں ہندستان کے اس مسئلہ کو حل کرسکتا ہے جس کو نہرو نے "ہندو فرقہ پرستی" کہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی تمام تر مسلم فرقہ پرستی کا ردعمل ہے، اور یہ صرف مسلمان ہیں جو قرآن کے اصول کے مطابق، صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کرکے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرسکتے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان اس "ہندو فرقہ پرستی" کے جواب میں آج بھی ٹھیک وہی طریقہ

اختیار کیے ہوئے ہیں جو انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لیگی لیڈروں کی رہنمائی میں اختیار کیا تھا، یعنی ہندو فرقہ سے براہ راست لڑنا، اس کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا، اس کی مذمت میں اپنے تمام الفاظ خرچ کر دینا۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں نے جو سیاست اختیار کی، اس کے تجربہ نے بتایا کہ مذکورہ بالا قسم کی جوابی تحریک صرف فرقہ پرستی کے مسئلہ کو بڑھاتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اسے کم نہیں کرتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ سے پہلے جس درجہ کی ہندو فرقہ پرستی سے دوچار تھے، آج اس میں سو گنا زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، ایسی حالت میں سابقہ پالیسی پر قائم رہنے کا آخر کیا جواز ہے۔ کیا مسلمان ایک بل میں دو بار ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث کے مطابق، ان کو مومنانہ بصیرت حاصل نہیں، وہ سرے سے ایمان کی روشنی ہی سے محروم ہیں۔

مدعو نہ کہ حریف

مسلمانوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہندستان کی فرقہ پرستی کا واحد حل وہی ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ یعنی صبر اور اعراض۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے، وہ ہر حال میں ردعمل کی روش سے بچیں گے۔ یہی پہلے بھی ان کے مسئلہ کا حل تھا اور آج بھی یہی ان کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا وہ تدبیریں جو ان کے بے ریش اور باریش رہنما ان کو بتا رہے ہیں، وہ صرف ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ ہرگز منزل کی طرف لے جانے والی نہیں۔

مسلمان اب تک ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ سراسر باطل ہے۔ وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے۔ مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس ملک میں خدا کے دین کے داعی ہیں۔ ہندو ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ مدعو اپنے داعی کا محبوب ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں کے تئیں اپنے نفرت کے جذبات کو کھرچ کر نکال دیں۔ اور ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ معاملہ کریں۔ یہی ان کے سارے مسائل کی کنجی ہے۔ یہی ان کی منزل کا آغاز ہے اور یہی ان کی منزل کا اختتام بھی۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو انگریزی الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے چار صفحہ کے

خط میں اپنا تبصرہ روانہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں ایک پیدائشی ہندو ہوں مگر میں کسی بھی مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ خواہ وہ ہندو مذہب ہو یا اور کوئی مذہب۔ البتہ میں انسانیت اور انسانی شرافت کا دل سے قائل ہوں۔ وہ مزید لکھتے ہیں :

A large number of Hindus are orthodox and they are routinely busy making money and performing rituals and ceremonies for serving their selfish ends, at the same time trying to "buy" a berth in *swarg* in the next world. And because they have lots of material possessions, they know they will stand to lose much in consequence of riots. But when they are goaded to the end of their tether by other communities, they sometimes let their resentment erupt but not for a long period of time.

K.L. Dutta, W. 6/110, Premnagar, Dehra Dun

ہندوؤں کی بڑی تعداد کٹر مذہبی ہے مگر وہ صبح و شام پیسہ کمانے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور رسوم و روایات کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں تاکہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کو پورا کر سکیں۔ اور اسی کے ساتھ اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ دوسری دنیا میں سورگ میں اپنے لیے ایک جگہ خرید سکیں۔ ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ فساد جیسی پرتشدد چیزوں میں حصہ لیں۔ اور چوں کہ ان کے پاس مادی ساز و سامان کافی موجود ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فسادات کے نتیجہ میں وہ بہت کچھ کھو دیں گے۔ مگر جب وہ دوسرے فرقوں کی طرف سے آخری حد تک چھیڑ دیے جاتے ہیں تو بعض اوقات ان کی ناراضگی ابل پڑتی ہے۔ مگر بہت زیادہ دیر تک کے لیے نہیں۔

مسٹر کے ایل دتہ کے اس نقطۂ نظر سے میں متفق ہوں۔ ہندو بنیادی طور پر ایک تاجر پیشہ قوم ہیں۔ اور فساد اور اس کے نتیجہ میں کرفیو کا سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ ہی کو پہونچتا ہے۔ اس لیے اصولی طور پر ہندو، بحیثیت قوم، فساد کو پسند نہیں کر سکتے۔

پھر فساد کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو سب کے سب تاجر نہیں ہیں۔ ان میں ایک طبقہ غیر تاجروں اور غریبوں کا ہے۔ یہی دوسرا طبقہ اکثر اوقات فساد کا ابتدائی سبب بنتا ہے۔ اس دوسرے طبقہ کا کوئی فرد ایک مسلمان کے ساتھ کوئی اشتعال انگیز کارروائی کرتا ہے، اور ایسا ہونا کسی آزاد سماج میں بالکل فطری ہے۔ اس وقت مسلمان بے برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ اشتعال انگیزی کی صورت میں مشتعل ہو کر لڑنے لگتا ہے۔

اس کے بعد خود مسلمانوں کی دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ دو فرد کا مسئلہ دو قوم کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی قوم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قومی شکایات جو سوئی ہوئی تھیں، اچانک جاگ پڑتی ہیں۔ قومی ساکھ اور قومی حمیت کا مسئلہ بن جانے کی وجہ سے دونوں فرقوں میں سے کوئی شخص یہ ہمت نہیں کرتا کہ وہ اپنے فرقہ کے خلاف بولے۔ تمام لکھنے اور بولنے والے یک طرفہ طور پر اپنے فرقہ کی حمایت اور دوسرے فرقہ کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ قومی حمایت کا یہی انداز ہندو بھی اختیار کرتے ہیں اور یہی انداز مسلمان بھی۔

اب فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنے کی تدبیر صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان پورے عزم کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں صرف اعراض کی پالیسی اختیار کریں گے نہ کہ لڑنے اور مقابلہ کرنے کی پالیسی۔

اگر مسلمان پوری طرح یہ فیصلہ کر لیں تو یقینی طور پر وہ فساد کی جڑ کاٹ دیں گے۔ اس کے بعد ہر چنگاری اپنے ابتدائی مرحلہ میں بجھ کر رہ جائے گی، وہ فساد اور قتل و خون کے مرحلہ تک نہ پہونچے گی۔ جہاں بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہاں لازمی طور پر ایسا ہی پیش آیا ہے۔

مسلمان اگر پوری طرح اعراض کی پالیسی اختیار کریں تو ابتدائی اشتعال کا ہر واقعہ صرف ایک شخصی واقعہ بن کر رہ جائے گا۔ وہ دو قوموں کے وقار کا مسئلہ نہیں بنے گا۔ اس کے بعد پولیس سے بھی مسلمانوں کی شکایت ختم ہو جائے گی۔ پولیس مسلمانوں کے لیے اس وقت ظالم بنتی ہے جب کہ مسئلہ دو قومی صورت اختیار کر لے۔ دو قومی صورت اختیار کرنے کے بعد مسلمان پولس کی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن اگر مسئلہ دو قومی نہ بنے تو وہ افراد پولیس کی گولی کا نشانہ بنیں گے جنھوں نے ابتدائی طور پر شرارت کی تھی۔

اسلام دور جدید کا خالق

صفحات ۱۱۲
ہدیہ ۱۵ روپیہ

مفاد کی سیاست

سابق شاہ ایران محمد رضا پہلوی (۱۹۸۰ - ۱۹۱۹) کے آخری دنوں کے حالات پر ایک معلوماتی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

William Shawcross, *The Shah's Last Ride*,
Chatto & Windus, London.

ایران کے سیاسی حالات جب شاہ کے لیے بہت زیادہ غیر موافق ہو گیے تو ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ کو وہ اپنے مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ امریکہ روانہ ہو گیے۔ اس کے بعد وہ مختلف ملکوں میں قیام کی کوشش کرتے رہے ——— مراکو، بہاماس، پناما، وغیرہ مگر کسی ملک نے ان کو قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ کے نکلنے کے بعد ایران کے انقلابیوں (صحیح تر لفظ میں تخریب کاروں) نے امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کر کے پچاس سے زیادہ امریکیوں کو یرغمال (Hostage) بنا لیا تھا۔ اس انجام سے بچنے کے لیے کوئی ملک ان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی جلاوطنی کی حالت میں قاہرہ میں ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شاہ کے عروج کے زمانہ میں برطانیہ ان کا بہت بڑا دوست سمجھا جاتا تھا۔ شاہ نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ ان کو اپنے یہاں داخلہ کی اجازت دیدے۔ مگر برطانی حکومت نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ موجودہ وزیر اعظم برطانیہ مسز مارگریٹ تھیچر اس وقت اپوزیشن میں تھیں۔ اس وقت انھوں نے برطانی حکومت کے انکار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ انھیں برطانی باشندہ ہونے پر شرم ہوگی اگر برطانیہ اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دے:

She would be ashamed to be British if the UK
did not stand by its friends.

اس کے جلد ہی بعد مئی ۱۹۷۹ میں برطانیہ میں الکشن ہوا۔ اس الکشن میں مسز مارگریٹ تھیچر کی پارٹی کامیاب ہوئی اور وہ برطانیہ کی وزیر اعظم بنا دی گئیں۔ اس وقت شاہ اور ان کی ملکہ بہاماس میں تھے۔ انھوں نے مارگریٹ تھیچر کی جیت پر خوشی منائی۔ مگر ان کی امیدوں کے خلاف

مارگریٹ تھیچر نے دوبارہ انھیں برطانیہ میں داخلہ کی اجازت نہ دی۔ مصنف کے نزدیک اس کی دو وجہ تھی۔ تہران میں برطانی سفارت خانہ کے عملہ کو یرغمال بننے سے بچانا اور ایران کے ساتھ برطانیہ کے تجارتی مفادات کا تحفظ :

It was partly a question of the security of Britain's Tehran diplomats, partly a matter of UK trading interests.

مارگریٹ تھیچر جب وزیر اعظم نہیں تھیں، اس وقت انھوں نے کہا کہ شاہ ایران کو پناہ نہ دینا برطانیہ کے لیے ایک شرم کی بات ہے۔ مگر یہی مارگریٹ تھیچر جب خود برطانیہ کی حکمراں بن گئیں تو انھوں نے بھی یہی کیا کہ شاہ ایران کو برطانیہ میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

بظاہر دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ مگر باعتبار حقیقت دونوں ایک ہیں۔ دونوں ہی کا اصل محرک ذاتی مفاد ہے۔ مارگریٹ تھیچر جب اپوزیشن میں تھیں تو ان کا مفاد اس میں تھا کہ وہ حکمراں پارٹی کو مطعون کرنے کے لیے شاہ کی حمایت کریں۔ اس کے بعد جب مارگریٹ تھیچر خود حکمراں بن گئی تو ان کا مفاد یہ بن گیا کہ وہ بھی وہی کریں جو ان سے پہلے کی حکمراں جماعت کر رہی تھی۔

بے اصول سیاست کی یہ قسم صرف "کفر پسندوں" کی اجارہ داری نہیں، وہ یکساں درجہ میں "اسلام پسندوں" کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ میں پاکستان میں صدر کے عہدہ کے لیے الکشن تھا۔ اس موقع پر وہاں کے اسلام پسندوں نے محمد ایوب خاں کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا۔ اس وقت انھوں نے زور و شور کے ساتھ دعویٰ کیا کہ اسلام میں عورت کی حکمرانی جائز ہے۔ مگر دسمبر ۱۹۸۸ کے الکشن کے بعد جب بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیر اعظم بن گئیں تو اب یہی اسلام پسند اپنی ساری طاقت یہ ثابت کرنے میں لگائے ہوئے ہیں کہ اسلام میں عورت کو حکمراں بنانا جائز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مذہب مفاد پرستی ہے، غیر مسلموں کا بھی اور ان لوگوں کا بھی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

آخر سے آغاز

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر فسادات کے معاملہ میں آپ کے نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ آپ صبر و اعراض کو فساد کے مسئلہ کا حل بتاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ صبر و اعراض کہاں تک۔ اگر فرقہ پرست لوگ ہمارے گھروں میں گھس آئیں اور ہماری ماں بہن کو بے عزت کرنے لگیں تو کیا اس وقت بھی ہم صبر و اعراض کی پالیسی پر عمل کرتے رہیں گے۔

میں نے کہا کہ آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ کہانی کو آخر سے شروع کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الرسالہ کی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ فرقہ پرستوں کا گھر کے اندر گھس جانا یہ کہانی کا آخری حصہ ہے۔ یہی وہ چیز نہیں جہاں سے کہانی شروع ہوتی ہو۔

پھر میں نے کہا کہ ہندستان کا کوئی فرقہ وارانہ فساد ایسا نہیں ہے جو یہاں سے شروع ہوا ہو کہ اچانک فرقہ پرست لوگ مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر غنڈہ گردی کرنے لگے ہوں۔ اگر آپ ایسے کسی فساد کا نام بتائیں تو میں سفر کر کے وہاں جاؤں گا اور اس کی تحقیق کروں گا۔ مگر وہ ایسے کسی فساد کا نام و پتہ نہ بتا سکے۔

اصل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فساد ہمیشہ "سڑک" سے شروع ہوتا ہے نہ کہ "گھر" سے۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ باجا بجاتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرتا ہے۔ مسلمان انتہائی ناقابلِ فہم طور پر اس کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں روک ٹوک شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں سے بات بڑھتی ہے جو بالآخر فساد تک پہونچتی ہے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کر لیں تو "سڑک" کا واقعہ سڑک تک رہ جائے، وہ "گھر" کے اندر تک نہ پہونچے۔

اس قسم کے تمام جھگڑے صرف نادانی ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات دراصل مسلمانوں کی نادانی کی قیمت ہیں۔ نادانی نے انھیں پیدا کیا ہے، اور نادانی کو ختم کر کے ہی ان کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری ہر تدبیر صرف فساد کو بڑھانے والی ہے نہ کہ فساد کو گھٹانے والی۔

ایک موت

ویر بہادر سنگھ ۱۸ فروری ۱۹۳۵ کو ہرناہی (گورکھپور) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ کانگرس میں شریک ہوگیے اور ترقی کرتے کرتے وزارت کے عہدے تک پہونچے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۵ کو انھوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ وہ تین سال سے زیادہ عرصہ تک اس عہدہ پر رہے۔ اس کے بعد انھیں دہلی کی مرکزی حکومت میں مواصلات کا وزیر بنا دیا گیا۔ مرکزی وزیر کی حیثیت سے وہ ٹیلی کمیونی کیشن کی بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس گیے ہوئے تھے۔ وہاں عین کانفرنس کی کارروائی کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا، اور ۳۰ مئی ۱۹۸۹ کو پیرس کے اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یوپی میں بابری مسجد اور میرٹھ کے واقعات ویر بہادر سنگھ ہی کے زمانہ میں پیش آئے تھے۔ اس بنا پر وہ مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ بدنام ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا کے لکھنؤ اڈیشن کے اڈیٹر مسٹر وی ایم بادولا نے ویر بہادر سنگھ کے حالات پر ایک مضمون لکھا ہے جو ٹائمس آف انڈیا (۳۱ مئی ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے:

He displayed an utter lack of political farsightedness. He never cared to look back, as he often boasted, but then, he was also incapable of looking ahead. A case in point was his handling of the Babri Masjid issue and he is said to have masterminded the opening of the locks of the disputed property at the instance of Mr. Arun Nehru, then Union minister for internal security, only to appease the Hindus. The mishandling of the Muslim problem in general and the Meerut riots in particular did not particularly endear him to the people (p. 13).

انھوں نے سیاسی دور اندیشی کے کامل فقدان کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ وہ اکثر پُرفخر طور پر کہا کرتے تھے، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ پیچھے کی طرف مڑکر دیکھیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ آگے کی طرف دیکھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس کی ایک بہت واضح مثال بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہی اس کا دماغ تھے اور انھیں نے سابق مرکزی وزیر مسٹر ارون نہرو کے اشارہ پر اس متنازعہ

عمارت کا تالا کھلوایا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس طرح وہ ہندوؤں کو خوش کر سکیں گے۔ مسلمانوں کے مسئلہ کو، خاص طور پر میرٹھ کے فسادات کو برے طریقہ سے انجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عوام کے اندر مقبولیت حاصل نہ کر سکے (صفحہ ۱۳)

مسٹر بادولا کے یہ الفاظ پڑھ کر میں نے سوچا کہ ویر بہادر سنگھ کے بارہ میں اتنا کھلا ہوا تبصرہ شاید کوئی مسلم دانشور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بلاشبہ یہ انتہائی منصفانہ اور جرأت مندانہ تبصرہ ہے اور مسٹر بادولا اس کے مستحق ہیں کہ ملک کے نمبر ایک انگریزی اخبار میں ایسا تبصرہ شائع کرنے پر انھیں مبارکباد دی جائے۔

مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں آجکل جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، وہ اس ملک کے بارہ میں تعصب اور ظلم کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ انھیں "ویر بہادر سنگھ" کی خبر ہے، مگر انھیں "وی ایم بادولا" کی کوئی خبر نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اعلان کیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر بھی موجود رہتا ہے۔ مگر موجودہ مسلمان لیڈر "یسر بلائنڈ" ہو چکے ہیں۔ ان کو یہاں صرف عُسر دکھائی دیتا ہے، یسر کے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں مگر وہ انھیں نظر نہیں آتے۔

دوسری بات ویر بہادر سنگھ سے متعلق ہے۔ انھوں نے اپنی وفات سے صرف چند ماہ پہلے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں آج میں جیتا ہوں، میں کل کی پروا نہیں کرتا۔ انھوں نے "میرٹھ" اور "بابری مسجد" کے معاملہ میں جو کچھ کیا، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ صرف اپنے آج کو دیکھتے تھے، وہ کل کی فکر نہیں کرتے تھے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ ان کا آج چند دن بعد "۳۰ مئی" کو ختم ہو جانے والا تھا۔ اس کے بعد جو کل ان کے لیے مقدر تھا، وہ یہ کہ وہ ایک عام انسان کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں جواب دہی کے لیے حاضر کر دیے جائیں۔ ویر بہادر سنگھ اگر اس حقیقت کو جانتے تو وہ آج سے زیادہ کل کے لیے فکر مند ہوتے، اس کے بعد وہ اس سے بالکل مختلف انسان بن جاتے جیسا کہ وہ اپنی زندگی کے آخر تک بنے رہے۔ "آج" کو جاننا آدمی کو سرکش اور بے انصاف بناتا ہے، اور "کل" کو جاننا ذمہ دار اور انصاف پسند۔ لوگ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ سرکش اور بے انصاف بنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے کل کو جانیں تو ان کی زندگیاں بالکل بدل جائیں۔

روس میں اسلام

بیس سال پہلے ٹائم میگزین کا نمائندہ ماسکو سے نکال دیا گیا تھا۔ اب موجودہ روسی وزیر اعظم گورباچیف کی نئی پالیسی گلاسناسٹ (Glasnost) کے تحت دوبارہ مواقع ملے تو ٹائم کے ادارہ نے جدید اشتراکی روس پر تفصیلی رپورٹ تیار کرنے کا پروگرام بنایا۔ ایک درجن رپورٹر اور ۵ فوٹو گرافر امریکہ سے روس گیے اور چار مہینہ تک روس کے مختلف حصوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے جو رپورٹ تیار کی، وہ ٹائم (۱۰ اپریل ۱۹۸۹) کے ۶۲ صفحات میں شائع ہوئی ہے۔

یہ رپورٹ سوویت یونین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی براہ راست معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کا صفحہ ۵۸-۶۹ روس میں اسلام کی موجودہ حالت کے بارے میں ہے۔ عنوان ہے —— اسلام اپنی آواز دوبارہ حاصل کرتا ہے:

Islam Regains its Voice

ان دونوں صفحات میں جو مضمون ہے، اس کے ساتھ روسی مسلمانوں کی دینی زندگی سے متعلق تین رنگین تصویریں دی گئی ہیں۔ یہ دونوں صفحے اپنی ترتیب اور طباعت کے اعتبار سے اس قدر پرکشش اور شاندار ہیں کہ ان کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کا ایک بھی ایسا میگزین نہیں جو "روس میں اسلام" کے بارے میں ایسی براہ راست اور اتنی خوبصورت رپورٹ پیش کر سکے۔ صحافت موجودہ زمانہ میں قومی تعمیر کی بنیاد ہے۔ جس قوم کے پاس طاقت ور صحافت نہیں، اس کو قبرستان میں تو یقیناً جگہ مل سکتی ہے، مگر آج کی دنیا میں زندگی کے میدان میں اس کا کوئی مقام نہیں۔

یہ رپورٹ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتی ہے: اللہ اکبر اللہ اکبر، تاشقند کے مینار سے اسلامی عبادت کی پکار بلند ہوتی ہے۔ رپورٹ میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ روسی گورنمنٹ آج کل اسلام کے بارے میں فراخی کا ثبوت دے رہی ہے۔ ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد روس میں ۲۶ ہزار مسجدیں اور ۲۴ ہزار مذہبی مدرسے بند کر دیئے گیے تھے۔ ان میں سے ۱۴۰۰ مسجدیں دوبارہ کھول دی گئی ہیں۔

روسی حکومت آج کل اسلام کے بارے میں زیادہ روادار ہے۔ نئی مسجدیں کھولنے کے علاوہ حکومت نے عملی طور پر اینٹی مسلم پروپیگنڈے کو تقریباً بند کر دیا ہے۔ اسلام دوسرے مذہبوں کی طرح روس کی نئی سوچ سے فائدہ اٹھانے والوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے :

Yet the government is more tolerant of Islam these days. Besides opening new mosques, the regime has virtually ended official anti-Muslim propaganda... Islam, like the country's other religions, is a major beneficiary of "new thinking" (p. 59).

سوویت روس کے نظام میں یہ تبدیلی مختلف اسباب سے ہوئی ہے۔ تاہم اس نے روسی مسلمانوں کو کام کرنے کا نیا موقع دے دیا ہے۔ مگر اس موقع سے فائدہ اٹھانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ روس کے مسلمان یہ بھی جانتے ہوں کہ موجودہ آزادی محدود ہے نہ کہ لامحدود۔ وہ حاصل شدہ کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنائیں نہ کہ غیر حاصل شدہ کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کا خاص سبب ان کی غیر حکیمانہ سرگرمیاں ہیں۔ وہ ممکن پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ناممکن پر دوڑتے ہیں۔ وہ ملے ہوئے کے بجائے نہ ملے ہوئے پر اپنی نظریں جمائے رہتے ہیں۔

ان کا حال یہ ہے کہ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں بولتے ہیں۔ جہاں گفت وشنید کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنا چاہیے وہاں ایجی ٹیشن کی دھوم مچاتے ہیں۔ جہاں محبت کی فضا پیدا کرنا چاہیے وہاں عداوت کا طوفان کھڑا کرتے ہیں۔ جہاں صبر و اعراض پر قائم ہونا چاہیے وہاں لڑائی اور ٹکراؤ کی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ وہ موقع جب کہ گھروں میں بیٹھنا چاہیے وہاں جلوس بنا کر سڑکوں پر نعرہ بازی کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔

اس دنیا میں "ممکن" کو استعمال کرنے کا نام عمل ہے، نہ کہ "ناممکن" کے پیچھے بے فائدہ دوڑنے کا۔ مگر یہی وہ سادہ سی بات ہے جس کو نہ مسلمانوں کے اصاغر جانتے ہیں اور نہ ان کے اکابر۔

تجارت کا میدان

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ (کنز العمال) یعنی روزی کے ۹۰ فی صد حصے تجارت میں ہیں۔

یہ حقیقت قدیم روایتی زمانہ میں ایک قسم کی پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیوں کہ قدیم زمانہ میں اصل اہمیت زراعت کی تھی نہ کہ تجارت کی۔ مگر آج پیغمبر کا یہ کلام ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نئے طریقوں کی دریافت نے تجارت کی وسعت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔ آج تجارت دوسرے ذرائع معاش پر بدرجہا زیادہ فائق ہو چکی ہے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے پارسی ہیں۔ ہندستان میں پارسیوں کی تعداد بمشکل ایک لاکھ ہے۔ مگر تجارت کے میدان میں عمل کر کے انھوں نے ملک کی دولت کے ایک بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔

موجودہ زمانہ میں تجارت کی فوقیت صرف ملازمت اور زراعت جیسے روایتی ذرائع ہی پر قائم نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس نے سیاست اور فوج اور ہتھیار جیسی چیزوں پر بھی فیصلہ کن غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان نے اپنی تجارتی ترقی کے ذریعہ یہاں تک بالاتری حاصل کی کہ اس نے امریکہ کی فوجی اور سیاسی طاقت کو اپنے مقابلہ میں بے اثر بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو دیکھئے اور اس کے بعد موجودہ مسلمانوں کی روش پر غور کیجئے۔ ہندستان کے مسلمان آج سب سے زیادہ جس بات کی شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جاتا۔ ملازمتوں اور داخلوں کے کوٹہ میں ان کے لیے رزرویشن نہیں ہے۔

مسلمانوں کی یہ روش پیغمبر اسلام کے خلاف عدم اعتماد کے اظہار کے ہم معنی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ فرما رہے ہیں کہ رزق کا ۹۰ فی صد حصہ تجارت میں ہے۔ پیغمبر اسلام کی اسی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ اور تابعین بہت بڑے پیمانہ پر تجارتوں میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ صحابہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خشکی اور تری میں تجارت کیا کرتے تھے (انّ الصحابۃ کانوا یتجرون فی البر والبحر۔)

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبرؐ کے اس کلام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تجارت کا میدان ان کے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے مگر وہ اس میں محنت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ اس ذریعۂ معاش کی طرف اپنی نظریں لگائے ہوئے ہیں جو پیغمبر کے ارشاد کے مطابق، معاشی ذرائع کے صرف دس فی صد حصہ پر مشتمل ہیں۔ وہ اس ذریعہ معاش کو عملاً چھوڑے ہوئے ہیں جو ۹۰ فی صد معاشی ذرائع سے تعلق رکھتا ہے۔

موجودہ مسلم رہنماؤں نے ایسے اخبار اور رسالے نکال رکھے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ہفتہ یا ہر مہینہ مسلمانوں کو اس بات کی خبر دیں کہ فلاں سروس میں ان کا تناسب اتنا کم ہے اور فلاں داخلہ میں وہ اتنی کم تعداد میں لیے گیے ہیں۔ اس قسم کے پرچے نکالنے والے بیک وقت دو جرم کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ پیغمبر اسلامؐ کی، نعوذ باللہ تحقیر کر رہے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ارشاد سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی دے رہے ہیں کہ اگر تمہارے لیے دس فی صد ذرائع والے میدان میں مواقع نہیں ہیں تو اس کی پروا نہ کرو۔ تم اس میدان میں داخل ہو جاؤ جو ذرائع معاش کے ۹۰ فی صد حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جو آج بھی تمہارے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ مگر مسلمانوں کے جھوٹے لیڈر رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرکے چیخ رہے ہیں کہ اصل معاشی میدان تو ملازمتوں کا میدان ہے اور وہاں مسلمانوں کے لیے دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

قرآن کے مطابق، جو شخص رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرے اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (الحجرات ۲) اس آیت کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد لیڈر حبطِ اعمال کے اس قانون کی زد میں آگیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ۵۰ سالہ چیخ پکار مکمل طور پر بے فائدہ ثابت ہوئی۔ وہ اپنے دعویٰ کے مطابق، ملازمتوں کی فہرست میں، مسلمانوں کا اضافہ کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

مسلمانوں نے اگر بالفرض اس ملک میں "۱۰ فی صد" رزق والے میدان کو کھو دیا ہو تب بھی "۹۰ فی صد" رزق والا میدان اب بھی ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ اس دوسرے وسیع تر میدان میں داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد انھیں اپنے ماحول کے خلاف تعصب اور امتیاز کی شکایت نہ ہوگی۔

شکایت یا تدبیر

آپ راستہ چل رہے ہیں۔ درمیان میں ایک جھاڑی کے کانٹے سے آپ کا دامن الجھ جاتا ہے۔ ایسے وقت میں آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ "شکایت" کے بجائے "تدبیر" کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ جھاڑی کے خلاف احتجاج نہیں کرتے، بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کون سی صورت اپنائیں جس سے مسئلہ حل ہو جائے۔

عقل مند آدمی جانتا ہے کہ یہی طریقہ اس کو انسان کے معاملہ میں بھی اختیار کرنا ہے۔ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہونچ جاتی ہے۔ کسی شخص کے متعلق ہمارا احساس ہوتا ہے کہ اس نے ہمارا حق ہم کو نہیں دیا۔ ایسے ہر موقع پر دوبارہ ہمیں شکایت کے بجائے تدبیر کا انداز اپنانا چاہیے۔

زندگی کا ہر مسئلہ ایک چیلنج ہے نہ کہ ایک شخص کے اوپر دوسرے شخص کی زیادتی۔ آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ پیش آئے، اور آپ اس کو زیادتی سمجھیں تو اس سے شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا ہوگا۔ حتی کہ یہ ذہن آپ کو یہاں تک لے جا سکتا ہے کہ آپ مایوسی کا شکار ہو جائیں۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ موجودہ ماحول میں آپ کے لیے کچھ کرنا ممکن ہی نہیں۔ شکایت کا ذہن مایوسی تک لے جاتا ہے، اور مایوسی کا ذہن نفسیاتی خودکشی تک۔

اس کے برعکس اگر آپ کا یہ حال ہو کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آپ اس کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں، تو اس سے آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوں گی۔ آپ کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ اول الذکر صورت میں آپ کا ذہن اگر منفی رُخ پر چل رہا تھا تو اب آپ کا ذہن تمام تر مثبت رُخ پر چل پڑے گا ——— یہی ایک لفظ میں، موجودہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے۔ اس دنیا میں جو شخص مسائل سے شکایت اور احتجاج کی غذا لے، اس کے لیے یہاں بربادی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کا حال یہ ہو کہ مسائل کا سامنا پیش آنے کے بعد اس کا ذہن تدبیر تلاش کرنے میں لگ جائے، وہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا، کیوں کہ اس دنیا میں ہر مسئلہ کا ایک حل ہے اور ہر مشکل کی ایک تدبیر۔

اب وہ نوجوان اوزار سازی کا ماہر ہوگیا ہے اور اس کے ذریعہ اچھی کمائی کر رہا ہے۔

بہت سے مسلمان آپ کو اس قسم کی منت ماننے والے ملیں گے۔ آپ ان کو منع کریں تو وہ کہیں گے کہ "ہمارا مقصد پورا ہوتا ہے تو ہم کیوں نہ کریں"۔ مگر یہ صرف غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں بے پناہ صلاحیت بھری ہوئی ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اس صلاحیت کو حرکت میں لایا جائے۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز یقین ہے۔ نوجوان نے "اوزار" اپنی عقل سے بنایا۔ البتہ اس کی عقل کو متحرک کرنے کے لئے یقین اور حوصلہ کی طاقت درکار تھی۔ جب اس نے تعزیہ پر چاندی کا اوزار چڑھانے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت پیدا کرلی۔ اس کی نفسیات یہ ہوگئی کہ اب میں نے تعزیہ کو چڑھاوا دینے کی منت مان لی ہے، اب تو میں اس کی مدد سے ضرور یہ کام کرلوں گا۔ اس طرح چڑھاوے کی منت سے اس کو یقین اور حوصلہ کی طاقت مل گئی۔ اس کے ذریعہ اس نے اوزار بنالیا۔ اس یقین کا حقیقی سرچشمہ اللہ کا عقیدہ ہے۔ مگر نادان آدمی دوسری چیزوں پر عقیدہ کو اپنے یقین کا سرچشمہ بنالیتا ہے۔

عبد القیوم صاحب (۳۸ سال) پالی کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پالی میں اتنا تعصب ہے کہ اگر سڑک پر کوئی ایکسیڈنٹ ہوجائے تو لوگ سب سے پہلے یہ پوچھتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کرنے والا کون ہے۔ چوڑی بازار میں آگ لگ گئی تو پوچھنے والے صرف یہ پوچھتے تھے کہ آگ کس نے لگائی۔ لوگوں کو آگ بجھانے سے دل چسپی نہیں، بلکہ یہ جاننے سے دل چسپی ہے کہ آگ لگانے والا کون ہے۔

حالت یہ ہے کہ پوچھنے والے کو اگر یہ بتایا جائے کہ آگ لگانے والا یا ایکسیڈنٹ کرنے والا مسلمان ہے تو ہندو طوفان کھڑا کردیں گے۔ اور اگر یہ بتایا جائے کہ آگ لگانے والا یا ایکسیڈنٹ کرنے والا ہندو ہے تو مسلمان بپھر کر ہنگامہ کرنے لگیں گے۔

عبد القیوم صاحب پالی میں پینٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ ان کا کام ۹۰ فی صد ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ وہ سچائی کے ساتھ اور محنت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام ہندو ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو ان پر اتنا اعتماد ہوگیا ہے کہ گھر کی کنجی انھیں دے کر باہر چلے جاتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں پالی میں فساد ہوگیا۔ بہت سی دکانیں جلادی گئیں۔ شہر میں کرفیو

لگ گیا۔ اس وقت وہ ہندو محلہ میں تھے۔ ہندوؤں نے ان کی پوری حفاظت کی۔ کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ "اصل چیز اپنا اخلاق ہے"۔ عبد القیوم صاحب نے اپنے سادہ لفظوں میں کہا۔ "ہم اپنا اخلاق اور اپنی بول بات ٹھیک رکھیں تو وہ ہمارا پورا احترام کریں گے"۔

ایک بزرگ نے ایک صاحب کا ذکر کیا جنھوں نے ہمارے مشن کے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ کیا ہے اور کچھ لوگ "بغض معاویہ" کی نفسیات کے تحت ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تحسبونہ ھینا وھو عند اللہ عظیم کا معاملہ ہے۔ قیامت میں یہ لوگ اپنے جرم پر اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسوؤں کا سیلاب ہی ان کو غرق کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا۔

راجستھان کا ایک قصبہ مکرانہ ہے جو سنگ مرمر کے لئے مشہور ہے۔ مکرانہ جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا۔ البتہ یہاں کے بعض اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار ۱۶۰۶ میں یہاں سنگ مرمر کی موجودگی کا پتہ چلا۔ ہندستان میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مقام ہے۔ مسٹر جی ایل کٹاریا (اسسٹنٹ مائننگ انجینئر، مکرانہ) کے بیان کے مطابق، یہاں تقریباً ۵۰ ملین ٹن سنگ مرمر کا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ذخائر ۵۰ فٹ نیچے شروع ہو جاتے ہیں اور ۲۵۰ فٹ تک جاتے ہیں۔ یہ ذخائر تقریباً ۲۵ کلو میٹر کے رقبہ میں زیر زمین پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے ریاست کے خزانہ کو سالانہ چار کرور روپیہ بطور ٹیکس وصول ہوتا ہے۔ شاہجہاں نے مکرانہ کے پتھروں ہی سے آگرہ کا تاج محل بنوایا تھا۔ اسی وقت سے مکرانہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت مکرانہ میں ۶۵۰ کانیں ہیں۔

پنجاب اور یوپی اگر درختوں کے باغ ہیں تو راجستھان طرح طرح کے پتھروں کا باغ ہے۔ خدا کے جو کلمات درخت کے نازک پتوں پر لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، وہی کلمات پتھروں کی دنیا میں سنگی تحریروں کی صورت میں لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے مکرانہ کے ایک صاحب سے پوچھا کہ کیا مکرانہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے پتھروں کے ورق پر لکھی ہوئی خدا کی کتاب پڑھی ہو۔ اس سوال کو سن کر وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے میں نے روسی یا جاپانی زبان میں ان سے کوئی سوال کر دیا ہو۔

۳۰ جولائی کو دوپہر بعد شیو گنج سے سروہی کے لئے روانہ ہوا۔ سروہی ایک پرسکون اور

صحت بخش مقام ہے۔ اس سفر میں حاجی عبد الکریم صاحب، ظفر مسعود رضوی صاحب اور کچھ دوسرے لوگ ساتھ تھے۔

ظفر مسعود رضوی صاحب (۴۸ سال) سرو ہی میں رہتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ ان کے یہاں الرسالہ کے کیسٹ بھی موجود ہیں۔ وہ اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ ایک روز ان کے یہاں "تعمیر ملت" نام کا کیسٹ بج رہا تھا۔ ان کے پڑوس میں مسٹر کرشن کمار ماتھر نیچے کے حصہ میں رہتے ہیں۔ مسٹر ماتھر کے کان میں اس کی آواز گئی تو انھیں دل چسپی ہوگئی۔ انھوں نے کیسٹ کو مانگ کر دوبارہ اس کو مکمل طور پر سنا۔ اب ان کی دل چسپی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہر مہینہ الرسالہ (اردو) کو پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے کئی اور ہندو بھی۔

سرو ہی میں ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ میں نے مسلمانوں کے بعض اجتماعات میں شرکت کی ہے۔ وہ لوگ اجتماع کے آخر میں لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں۔ مگر ساری دعا صرف مسلمانوں کے لئے ہوتی ہے۔ ملک کی خوش حالی یا قوم کی ترقی کے لئے کوئی دعا نہیں کی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو صرف اپنے گروہ سے دل چسپی ہے۔ ملک و قوم سے آپ لوگوں کو کوئی دل چسپی نہیں۔ یہ تنقید میرے نزدیک بجا ہے۔ مسلمانوں کو اس پر دھیان دینا چاہئے۔

یہاں ایک معروف شخص ماسٹر من موہن لال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرو ہی ضلع (اور اسی طرح دوسرے مقامات پر) ملی جلی کمیٹی بنائی جائے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں۔ اگر کہیں مسلمان زیادتی کرتے ہیں تو ان کے خلاف کمیٹی کے مسلم ممبران آواز اٹھائیں۔ اور اگر کہیں ہندو زیادتی کرتے ہیں تو کمیٹی کے ہندو ممبران اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ ہندو بولنے والے ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف بولتے ہیں، اسی طرح مسلمان بولنے والے ہمیشہ ہندوؤں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ یہ بالکل بے فائدہ ہے۔ اگر ماسٹر من موہن لال کی تجویز پر عمل کیا جائے تو یقیناً فساد کی حوصلہ شکنی ہوگی اور ان میں بہت کمی آجائے گی۔

سرو ہی سے آبو روڈ جاتے ہوئے پنڈوارا ملتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اگست ۱۹۸۷ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ یہاں ایک مسلمان کی کرانہ کی دکان ہے۔ یہاں سے مزدور طبقہ

کے ایک ہندو نے کچھ سامان ادھار خریدا۔ بعد کو ایک روز مسلم دکان دار نے مذکورہ ہندو سے پیسہ کا تقاضا کیا۔ ہندو نے پیسہ نہیں دیا تو دکان دار نے اس کی سائیکل رکھ لی۔ ہندو نے مقامی آر ایس ایس والے سے شکایت کی۔ وہ آئے اور دکان دار سے کہا سنا۔ دکاندار نے سائیکل واپس کر دی۔

بظاہر بات ختم ہو گئی۔ مگر ایک مسلم نوجوان جو مذکورہ دکاندار کا دوست تھا۔ اس کو واقعہ معلوم ہوا تو اس نے مذکورہ ہندو کو بازار میں پکڑا اور اس سے تکرار شروع کی۔ اس دوران مسلم نوجوان نے ایک لکڑی لے کر اس کو مار دیا۔ اب ہندوؤں نے ہندو مزدور کی طرفداری کرتے ہوئے مسلم نوجوان کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سخت زخمی ہو کر وہ مسلمان مر گیا۔ تاہم بات اس کے بعد زیادہ آگے نہیں بڑھی۔ ایڈمنسٹریشن نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔

اسی راستہ میں دوسرا قصبہ سروپ گنج آتا ہے۔ یہاں فروری ۱۹۸۹ میں فساد ہوا تھا۔ ہیڈگواڑ جنم شتابدی منائی جا رہی تھی۔ اس موقع پر آدی واسی تقریباً ۵ ہزار کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ایک جلوس نکالا جانا تھا۔ جلوس کا راستہ ایک مسجد سے گزرتا تھا۔ مسلمانوں کو اس پر اعتراض ہوا۔ اب تناؤ بڑھا۔ انتظامی افسران نے چند ہندوؤں اور چند مسلمانوں کو بلا کر گفتگو کی۔ ہندوؤں نے کہا کہ اگر آپ ہمارے جلوس کو اپنے علاقہ سے گزرنے سے روکیں گے تو ہم بھی آپ کا کوئی جلوس اپنے علاقہ سے گزرنے نہیں دیں گے۔ آخر کار مسلمان راضی ہو گئے اور یہ طے ہو گیا کہ ہندوؤں کا جلوس مسجد کی طرف سے گزر جائے۔

مگر مسلم صاحبان نے واپس آکر اس سمجھوتہ کی خبر فوراً مسلمانوں کو نہ دی۔ اور نہ وہ جلوس کے وقت مسجد کے پاس موجود رہے کہ اعلان کر کے مسلمانوں کو اس کی بابت بتائیں۔ چنانچہ عام مسلمان سابقہ ذہن میں رہے۔ جلوس جب مسجد کے سامنے سے گزرا تو کسی مسلمان یا چند مسلمانوں نے جوش میں آکر جلوس پر پتھر پھینک دیا۔ اس پر فساد بھڑک اٹھا۔ جانی نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ مگر مسلمانوں کی تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کی جائداد جلا دی گئی۔

آبو روڈ کی ایک دیوار پر ہندی میں لکھا ہوا تھا "درگھٹنا چالک کے لئے کلنک ہے"۔ یعنی حادثہ ڈرائیور کے لئے داغ ہے۔ یہ بات جس طرح ایک گاڑی کے ڈرائیور کے لئے

صحیح ہے، اسی طرح وہ قوم کے لیڈر کے بھی صحیح ہے۔ لیڈر اپنی قوم کو ایک راستہ پر دوڑائے اور قوم اس پر چل کر بربادی کے گڑھے میں جا گرے، تو حساس لیڈر کے لئے ایسا کوئی واقعہ موت کا حکم رکھتا ہے۔ بے حس لیڈر ایسے موقع پر دوسروں کو بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر مطمئن ہو جائے گا۔ مگر حساس لیڈر کے لئے وہ ایسا حادثہ ہوگا کہ اس کی زبان بند ہو کر رہ جائے۔

راستہ میں بناس ندی پر ایک قدیم پل ہے۔ اس کا نام رجواڑہ پل ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کا بنا ہوا ہے۔ آج بھی وہ پوری طرح مضبوط ہے۔ مگر چوڑائی میں اتنا کم ہے کہ بیک وقت اس سے صرف ایک بڑی گاڑی گزر سکتی ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کے انسان کو "مضبوطی" کی اہمیت معلوم تھی، مگر اس کو "چوڑائی" کی اہمیت معلوم نہ تھی۔ یہ انسانی عقل کی محدودیت ہے۔ وہ صرف حال کو جان سکتا ہے، مستقبل کو یقینی صورت میں جاننا اس کے لئے ممکن نہیں۔

آبو روڈ سے ماؤنٹ آبو کا فاصلہ تقریباً ۲۸ کلو میٹر ہے۔ یہ پورا راستہ چکر دار پہاڑی سڑک پر طے ہوتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے پہاڑ اور گہری کھائی کے مناظر تھے۔ سرسبز درختوں سے پورا ماحول ڈھکا ہوا تھا۔ یہ ۳۰ جولائی کی شام کا وقت تھا۔ ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ گاڑی کی کھڑکیاں بند کر لی گئیں۔ اب شیشہ کے باہر درخت زور زور سے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ کہیں کہیں پورے درخت گرے ہوئے نظر آئے۔ مگر ہم گاڑی کے اندر شیشہ کے پیچھے بالکل محفوظ حالت میں بیٹھے ہوئے چلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اگر طوفان رکھا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یہاں ایسے اسباب بھی رکھ دئے ہیں کہ آدمی خارجی طوفان سے محفوظ رہ کر اپنا سفر طے کر سکے۔

۳۰ جولائی کی شام کو ہم لوگ ماونٹ آبو پہنچے۔ ماؤنٹ آبو ایک پہاڑی مقام ہے جو ضلع سروہی (راجستھان) میں واقع ہے۔ اس کا تعلق اراولی سلسلہ کوہ سے ہے۔ ماونٹ آبو میں کثرت سے جین مندر اور جین مذہب کی مقدس یادگاریں ہیں۔ یہاں پچھلے دو ہزار سال سے زائرین آتے رہے ہیں۔ ہندستان کے سنسکرت رزمیہ مہابھارت میں بھی اس کا تذکرہ آربودہ کے نام سے موجود ہے جس کے معنی مقام دانش کے ہوتے ہیں۔

ماونٹ آبو ایک مشہور پہاڑی تفریح گاہ ہے۔ یہاں ایک خاص طرح کا جین مندر ہے

جو پورا سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ بنایا گیا تھا۔ ماؤنٹ آبو کی سیاسی اہمیت اس وقت ہوئی جب انگریزی حکومت کے زمانہ میں "برٹش راجپوتانہ اسٹیٹس ایجنسی" یہاں قائم کی گئی۔ اس کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے۔

ہندستان میں جو مختلف مذہبی اور روحانی تنظیمیں ہیں، ان میں سے ایک تنظیم کا نام برہما کماری ہے۔ اس کے بانی دادا لیکھ راج (وفات ۱۹۶۹) ہیں۔ وہ حیدر آباد (سندھ) میں ہیرے کے تاجر تھے۔ ان کے پیروؤں کا عقیدہ ہے کہ شیو دیوتا دادا لیکھ راج کے اندر حلول کر گیا۔ اس کے بعد انھوں نے تجارت چھوڑ دی اور مذہبی اور روحانی تبلیغ میں لگ گئے۔

برہما کماری مشن کا ہیڈ کوارٹر ماونٹ آبو کی چوٹیوں پر ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس کی ۱۸۰۰ شاخیں قائم ہیں۔ یہ ایشیا کی واحد مذہبی تنظیم ہے جس کو اقوام متحدہ میں مشاورتی درجہ (Consultative Status) دیا گیا ہے۔ برہما کماری مشن سے وابستہ افراد تجرد کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب اور دوسری نشہ کی چیزوں سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔

اس تنظیم کے تصویری میوزیم ۵۲ ملکوں میں قائم ہیں جن کو وہ لوگ خدائی میوزیم (Godly Museum) کہتے ہیں۔ یہاں ہر روز صبح کو راجا یوگا کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ شیو کو پوجتے ہیں۔ ناخوشگوار موسم کے باوجود یہاں کافی چہل پہل نظر آئی۔ ان کے نظریات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے میں نے ان کے اندر ایک زندگی دیکھی جو عام طور پر ہمارے اداروں میں نظر نہیں آتی۔

اس ہیڈ کوارٹر کے تحت ایک اسپرچول یونیورسٹی ہے جس میں دو ہزار طالب علم رہتے ہیں۔ روزانہ تقریباً ایک ہزار آدمی اس کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ وسیع پیمانہ پر لوگوں کو مفت کھانا کھلانے کا انتظام ہے۔ صاف ستھرے ہالوں میں نہایت صاف ستھرا و بجیٹرین کھانا کھلایا جاتا ہے۔ وسیع رقبہ میں اس کے مختلف شعبے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ کارکنوں کی ایک پوری فوج پورے نشاط اور انہماک کے ساتھ ہر وقت اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ مگر سب کے سب بے معاوضہ ہیں۔ تمام کام مشن کے عورتیں اور مرد رضا کارانہ طور پر انجام دیتے ہیں جو تقریباً سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں۔ اور اکثر خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۳۱ر

جولائی کو جب میں نے اس مشن کو دیکھا، اس وقت میرے ساتھ چار آدمی اور بھی تھے۔

برہما کماری مشن کے سنٹر میں میں نے جو کچھ دیکھا اور وہاں کے ذمہ داروں سے جو باتیں ہوئیں، اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی وقت اس کو تحریر کیا جائے گا۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہندستان کی کئی مذہبی تحریکیں، جن میں برہما کماری اور سکھ دھرم شامل ہیں، ہندوازم اور اسلام کے بیچ میں ایک درمیانی راہ نکالنے کی کوشش تھی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ ان کو نہ ہندوازم ملا اور نہ اسلام۔

ٹرین میں ادھیڑ عمر کا ایک ہندو جوڑا تھا۔ بظاہر وہ خوش حال گھرانے کے افراد تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ برہما کماری سے تعلق رکھتے ہیں اور ماونٹ آبو جا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شادی کے بعد وہ لوگ برہما کماری تحریک سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۲۵ سال سے وہ بہن بھائی کی طرح رہ رہے ہیں۔ انھوں نے پھر کبھی ازدواجی تعلق قائم نہیں کیا۔

عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق فطرت کے عین مطابق ہے اور اس کے مقابلہ میں تجرد فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو اسلام میں غلو کہا گیا ہے۔ مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان فطری اور معتدل قسم کی مذہبی زندگی کی طرف کم رغبت کرتا ہے۔ اس کے بجائے غلو والی مذہبی زندگی میں اس کے لئے بڑی کشش ہے۔ جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، وہ بھی کم از کم ذہنی طور پر اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔

اس کی وجہ حقیقۃً مذہب پسندی نہیں بلکہ ظاہر پسندی ہے۔ غلو ہمیشہ ان چیزوں میں ہوتا ہے جو دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہری اور مقداری چیزوں میں اضافہ ہی کا نام غلو ہے۔ خود مسلمانوں میں فضائل کی موضوع روایتیں اور بزرگوں کے بارہ میں فرضی قصے تمام تر کمیاتی چیزوں میں مبالغہ سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ کیفیت والی چیزوں میں مبالغہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ "فارم" کو اہمیت دینے کا نام غلو ہے، اور "اسپرٹ" کو اہمیت دینے کا نام سچی مذہبیت۔

۳۱ جولائی کو ۱۰ بجے ماونٹ آبو کی نکی جھیل دیکھی۔ پہاڑ کے اوپر پانی کے بڑے بڑے ذخیرے جو اکثر بلندیوں پر دکھائی دیتے ہیں، وہ قدرت کا حیرت ناک معجزہ ہیں۔ اس جھیل کے اتر سمت میں ایک پختہ قبر ہے۔ یہ قبر احسان علی صاحب کی ہے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ کے

"غدر" میں وہ یہاں آئے۔ اس وقت راجپوتانہ کا انگریز ریزیڈنٹ سر ہنری لارنس یہاں رہتا تھا۔ احسان علی صاحب نے لارنس کے لڑکے پر گولی چلادی۔ مگر گولی اس کے پاؤں میں لگی۔ وہ بچ گیا۔

احسان علی صاحب ایک جھاڑی میں چھپے ہوئے پکڑ لئے گئے۔ انھیں گولی مار دی گئی۔ اس کے بعد ان کی لاش سر راہ عام پر لٹکا دی گئی۔ وہ تین روز تک وہاں لٹکی رہی۔ اس کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ یہ قبر آج تک جھیل کے کنارے موجود ہے اور اس پر "احسان علی شاہ" کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ دین وطنیت کی اصطلاح میں وہ ایک فریڈم فائٹر تھے۔ میرے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ان کی قبر پر فریڈم فائٹر کا کتبہ لگایا جائے نہ کہ احسان علی شاہ کا۔

ماؤنٹ آبو پر مجھے ایک بلڈنگ میں لے جایا گیا۔ یہاں ۱۹۸۵ سے "اقبال ہوسٹل" قائم ہے۔ اس میں زیر تعلیم بچوں کے لئے بورڈنگ اور لاجنگ کا انتظام ہے۔ یہ بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور یہاں قیام کرتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کے لئے قرآن (ناظرہ) پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ اردو بھی پڑھانا چاہئے کیونکہ موجودہ حالات میں ان کو دین سے باخبر رکھنے کے لئے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔

میں نے ایک گجراتی طالب علم اسماعیل گھانچی (۱۴ سال) سے بات کی۔ وہ ذہین نظر آیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں۔ اس نے کہا آٹھویں کلاس میں۔ اپنے اسکول کا نام اس نے روٹری اسکول (Roatry Integrated School) بتایا۔ میں نے کہا کہ اس بات کو انگریزی میں کہئے کہ میں آٹھویں درجہ میں پڑھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا:

I am studying in 8th standard.

اسی قسم کا ایک واقعہ کسی قدر مختلف شکل میں شیوگنج میں پیش آیا۔ وہاں میری ملاقات ایک مسلمان طالب علم سے ہوئی جو "میونسپل اسکول" میں پڑھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ آٹھویں کلاس کا طالب علم ہے۔ میں نے کہا کہ اس بات کو انگریزی میں کہئے کہ میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہوں۔ دیر تک سوچنے کے بعد بچے نے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے:

I am 8th class reading.

کتنا فرق ہے ایک اسکول میں اور دوسرے اسکول میں۔

محمد افضل صاحب (۴۸ سال) ماونٹ آبو میں انگریزی اسکولوں کے بچوں کا ہوسٹل چلاتے ہیں۔ ان کے کئی اور بھی کام ہیں۔ یہاں پہلی بار ان سے ملاقات اور واقفیت ہوئی۔ وہ نہایت سمجھدار اور بااثر آدمی ہیں۔ معاملات کی تدبیر کرنا بخوبی جانتے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: اگر ہم کسی سے نفرت نہ کریں تو کوئی ہم سے بھی نفرت نہیں کرے گا۔ اس علاقہ کے بعض اختلافی معاملات ان کے سامنے لائے گئے اور انھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو ختم کرا دیا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ایسا معاملہ نہیں جس کو خوش تدبیری سے حل نہ کیا جاسکے۔

محمد افضل صاحب سے ملاقات کے بعد میری ایک تجویز دوبارہ مجھے یاد آگئی جو برسوں سے میرے ذہن میں ہے۔ یہ تجویز قرآن (النساء ۸۳) پر غور کرنے سے سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ فساد کے معاملہ میں مسلمان ہر جگہ کچھ صاحب فہم اور صاحب اثر افراد کو اپنا ذمہ دار بنالیں۔ جب بھی کسی مقام پر دونوں فرقوں میں تناؤ اور اختلاف کی صورت میں پیدا ہو اور فساد کا اندیشہ ہو تو خود لڑائی چھیڑنے کے بجائے وہ صرف یہ کریں کہ ملاقات یا ٹیلیفون کے ذریعہ فوری طور پر ان ذمہ دار افراد کو اس کی اطلاع دیں۔ اس کے بعد خود کچھ نہ کریں بلکہ معاملہ کو ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ مکمل طور پر خاموش ہو جائیں۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو یقینی ہے کہ یہ افراد معاملہ کو ختم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جائیں گے۔ اس ملک سے فساد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس سفر میں ایک اور تجربہ ہوا۔ راجستھان میں اگرچہ جگہ جگہ کچھ لوگ فساد کے اسباب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ اس امن پسند ریاست میں ہندو مسلم نفرت کا ماحول پیدا ہو جائے۔ مگر میں نے اپنے سفر کے دوران کئی ایسی مثالیں دیکھیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسلمان اگر باہوش ہو جائیں تو فرقہ پرست عناصر کی ہر تخریبی کوشش یقینی طور پر ناکام ثابت ہوگی۔

مثلاً فالنا میں ایک مسلمان ہیں جو ٹیلی ویژن کا کچھ سامان بناتے ہیں۔ ان کا سامان دوسرے بنانے والوں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر بہتر ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسروں کے مقابلہ میں وہ اپنی مصنوعات کی قیمت بھی زیادہ لیتے ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ ان کے یہاں خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ہندو ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کو ان سے کوئی شکایت نہیں۔

اسی طرح آبو روڈ میں ایک مسلمان ہیں جن کے یہاں سلائی (ٹیلرنگ) کا کام ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف اچھا کام کرکے دیتے ہیں بلکہ سلوک کے اعتبار سے بھی نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں۔ ان کے گاہکوں میں ۹۵ فیصد تعداد ہندوؤں کی ہوتی ہے۔ مقامی ہندو عام طور پر ان کے ساتھ عزت اور محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

پالی میں چند مسلمان ہیں جو گھروں میں پینٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے لوگ ہیں اور اپنا کام ہمیشہ محنت اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ان کا کام بھی زیادہ تر ہندوؤں کے مکانات میں ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ ان کی بہت زیادہ قدر کرتے ہیں۔

اس طرح کی انفرادی مثالیں ہر شہر اور ہر بستی میں پائی جاتی ہیں۔ ہر جگہ ایسا ہے کہ کچھ مسلمان اپنے کام اور اپنے اخلاق کی وجہ سے ہندوؤں کے درمیان باعزت بنے ہوئے ہیں۔ یہ مثالیں واقعات کی زبان میں بتاتی ہیں کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان اچھے عمل اور اچھے اخلاق والے انسان بن جائیں۔ اس کے بعد ان کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ یہ طریقہ ان کی اپنی ذات کے لئے بھی مفید ہے اور پوری قوم کے لئے بھی۔

یہ ماؤنٹ آبو کے ہوٹل سن راک (Sun Rock) کا کمرہ ہے۔ میں سطح سمندر سے ۴ ہزار فٹ کی بلندی پر بیٹھا ہوں۔ تیز ہوا چل رہی ہے۔ شیشہ کے اُس پار تمام درخت ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سورج گہرے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

یہاں دہلی، بمبئی اور کلکتہ والی کثیف ہوا نہیں۔ پورا ماحول اس برائی سے خالی ہے جس کو فضائی کثافت (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔ تازہ اور صاف ہوا کے جھونکے چاروں طرف آکسیجن بکھیر رہے ہیں۔ مگر ہوٹل کے اندر بند کمرے کی ہوا باہر کی ہوا سے مختلف ہے۔ یہاں وہ فرحت بخش ہوا نہیں جو باہر افراط کے ساتھ موجود ہے۔

ہوٹل کے بند کمرے میں سکون ہے مگر فرحت بخش ہوا کے جھونکے نہیں۔ باہر فرحت بخش ہوا کے جھونکے ہیں مگر وہاں سکون کے لمحات نہیں۔ یہی اس دنیا میں زندگی کا معاملہ ہے۔ اگر آپ تازہ ہوا لینا چاہتے ہیں تو آپ کو طوفان کی زد میں آنا پڑے گا۔ اور اگر آپ طوفان سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو یہ صرف اس قیمت پر ہوگا کہ آپ تازہ ہوا میں سانس لینے سے محروم رہ جائیں۔

ماؤنٹ آبو کی اہمیت کو انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۲۶ میں راجپوتانہ کے انگریز ریزیڈنٹ نے ماؤنٹ آبو کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ اس کے بعد اس علاقے کے تمام راجاؤں نے یہاں اپنی اپنی کوٹھیاں بنانی شروع کر دیں۔

مگر مسلمان دور جدید سے عدم واقفیت کی بنا پر "ماؤنٹ آبو" کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ یہاں مجھے بتایا گیا کہ ماؤنٹ آبو کی بیشتر زمینیں مسلمانوں کی تھیں۔ مگر مسلمانوں نے نہایت معمولی قیمتوں پر اپنی زمینیں غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ میں نے بعض زمینیں دیکھیں جو مسلمانوں نے "ہزاروں" روپیہ میں بیچی تھیں وہ آج "کروروں" روپیہ کی ملکیت ہیں۔ کئی مسلمانوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی فضول خرچی کی بنا پر قرضوں میں پھنس گئے اور قرض اتارنے کی خاطر قیمتی زمینوں کو نہایت معمولی دام میں فروخت کر دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ راجستھان کے شہروں اور قصبوں کی دیواروں پر آجکل مسلم مخالف نعرے لکھے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو مسلم مخالف نعرے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر مجھے تو ہر جگہ یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

میں ۳۰ جولائی کی شام کو ماؤنٹ آبو پہنچا تو ایک شخص نے کہا کہ یہاں دیکھنے کی سب سے زیادہ خاص تاریخی چیز دیل واڑہ مندر ہے۔ اس کے کاریگروں نے "پتھر کو کاغذ بنا دیا"۔

۳۱ جولائی کو دیل واڑہ مندر دیکھا۔ یہ جینی فرقہ کا مندر ہے۔ ۱۰۳۱ء میں راجہ بھیم دیو (گجرات) کے وزیر اور کمانڈر ویمل شاہ نے اس کو مکمل کرایا۔ اس کی تعمیر میں ۸ اکروڑ ۵۳ لاکھ روپیہ کی لاگت آئی۔ ۱۵۰۰ کاریگروں اور ۱۲۰۰ مزدوروں نے ۱۴ سال تک کام کر کے اس کو مکمل کیا۔ یہ معلومات مندر کے دروازہ پر ایک کتبہ میں درج ہیں۔

پورا مندر تصویری نقاشی سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں صناعی کا کمال ضرور ہے مگر اس میں تاج محل والی سادگی نہیں۔ اس سے محظوظ ہونے کے لئے دو میں سے ایک چیز ضروری ہے ــــــ تصویر پسندی یا بت پرستی۔ فطری سادگی کا ذوق رکھنے والا آدمی اس سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔

۳۱ جولائی کو عصر کی نماز آبو روڈ کی ایک مسجد میں پڑھی۔ میں نے پوچھا کہ اس مسجد کا نام کیا ہے۔

لوگوں نے بتایا کہ "چھوٹی مسجد" میں نے کہا کہ یہ تو اچھی خاصی بڑی مسجد ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے وہ کافی چھوٹی تھی۔ تعمیر ثانی میں اس کی توسیع ہوئی۔ مگر نام وہی "چھوٹی مسجد" باقی رہا۔ اس دنیا کا نظام بھی عجیب ہے۔ یہاں کبھی چھوٹی چیز کو بڑا کہتے ہیں اور کبھی بڑی چیز کا نام چھوٹا رکھ دیتے ہیں۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۹ کی شام کو آشرم اکسپریس سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ آبو روڈ میں اپنے ڈبہ میں داخل ہوا تو اس کے اندر دو ہندو موجود تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا "آپ کیا کام کرتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا میری ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان ہے"۔ دوسرا بولا "اچھا میں تو ریڈی میڈ کپڑے تیار کراتا ہوں"۔ اس کے بعد دونوں میں وزٹنگ کارڈ کا تبادلہ ہوا، اور دونوں کے درمیان اپنے کاروبار کی باتیں ہونے لگیں۔

میں نے سوچا کہ عام لوگوں کے لئے باہم تعلق قائم کرنا بہت آسان ہے۔ کیوں کہ وہ سب ایک دنیا کے مسافر ہیں۔ وہ بہت جلد گفتگو اور تعلق کی مشترک بنیاد پالیتے ہیں، اس کے مقابلے میں ایک سچے مومن اور سچے داعی کے لئے تعلق قائم کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ کیوں کہ وہ لوگوں کے درمیان ایک غریب (اجنبی) شخص ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں میں کسی خاص کوشش کے بغیر باہم تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب کہ داعی اور مصلح کو تعلق قائم کرنے کے لئے یک طرفہ طور پر خصوصی اسباب جمع کرنے پڑتے ہیں۔ دوسرے لوگ جس چیز کو کسی غیر معمولی جدوجہد کے بغیر پالیتے ہیں، وہ داعی کو غیر معمولی جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اسی کا نام صبر ہے۔

صبر دعوت کی قیمت ہے۔ جو شخص صابر نہ ہو، وہ داعی بھی نہیں بن سکتا۔

الرسالہ (ہندی)

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی ایڈیشن نکالنے کی تیاریاں جاری ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد پہلا شمارہ منظر عام پر آرہا ہے۔ صاحبان ایجنسی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

فی شمارہ پانچ روپیہ ☐ سالانہ زر تعاون ساٹھ روپیہ

مینجر الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی امریکہ کے ایک اسلامک سینٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز میں ان کا ایک خصوصی لکچر تھا۔ لکچر کا عنوان تھا: اسلام امریکہ میں۔ موصوف نے اس موضوع پر مفصل تقریر کی۔ حاضرین میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوئے۔

نئی دہلی کے اسوکا مشن (Asoka Mission) کی طرف سے ایک عالمی امن سفر (Pilgrimage for active peace) بنایا گیا۔ اس کے تحت کچھ اعلیٰ تعلیم افراد ایشیا یورپ اور امریکہ کے چھ ملکوں کے دورہ پر یکم ستمبر ۱۹۸۹ کو روانہ ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس امن پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر وہ اس میں عملاً شریک نہ ہو سکے۔ البتہ کچھ متعلقہ انگریزی لٹریچر اس سلسلہ میں انھیں فراہم کر دیا گیا جس سے اس معاملہ میں اسلام کا نقطہ نظر واضح ہو سکے۔

اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والا مشہور اور نہایت کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ اس نے اپنے شمارہ ۱۶ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ میں پیغمبر انقلاب (انگریزی) پر پاکستان کے اول انعام کی خبر شائع کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے اسلامی مرکز کا اور اس کے دعوتی کاموں کا مفصل تعارف بھی شائع کیا ہے۔

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے ہال میں ۱۵ اگست ۱۹۸۹ کو اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Improving Indo-Bangladesh Relations

صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پاکستان کا ایک ادارہ الانصار المسلمون (لاہور) اسلامی مرکز کی کتاب "نار جہنم" بڑی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کر رہا ہے۔ پہلی بار اس نے یہ کتاب اکتوبر ۱۹۸۸ میں چھپوائی تھی۔ دوسری

بار اسس نے اس کو جنوری ۱۹۸۹ میں چھپوایا ہے۔ اس کی کتابت جدید طرز پر کمپوٹر ٹائپ سٹنگ کے ذریعہ کرائی گئی ہے۔

۶۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۱۲ اگست ۱۹۸۹ کی شام کو ایک پروگرام ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ اصحاب شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی دعوت کے جدید امکانات کے موضوع پر سوا گھنٹہ کی ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا کیسٹ مرکز میں موجود ہے۔

۷۔ "شتم رسول کا مسئلہ" نامی کتاب ۱۸۶ صفحات پر تیار ہو کر اس وقت پریس میں ہے۔ اس موضوع کے ہر پہلو پر اس میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

۸۔ وٹیکن کے زیر اہتمام وارسا (پولینڈ) میں ایک کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس ۳۱ اگست تا ۶ ستمبر ۱۹۸۹ جاری رہی۔ اس موقع پر شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کو مدعو کیا گیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ اس میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ زیر بحث موضوع سے متعلق ایک مقالہ انھیں بھیج دیا گیا۔ اس کا عنوان تھا: War and Peace in Islam یہ مقالہ انگریزی الرسالہ میں انشاء اللہ شائع کر دیا جائے گا۔

۹۔ بمبئی میں سیوری کے علاقہ میں ایک چال (بڑی بلڈنگ) ہے جس میں کئی سو آدمی رہتے ہیں۔ اس بلڈنگ کے داخلہ پر ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔ شیخ ابراہیم انجینئر، جو خود اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ وہ اکثر الرسالہ کا کوئی فقرہ اس بورڈ پر لکھ دیتے ہیں جس کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس سے اثر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ دوسرے مقامات پر بھی دہرایا جانا چاہیے۔

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ کے چند شمارے مرحوم نشتر ترکی کی ترغیب پر پڑھے۔ اس سے قبل میں الرسالہ اور آپ کی ذات سے سوء ظن میں مبتلا تھا۔ یہ مولانا عامر عثمانی مرحوم اڈیٹر تجلی کی ان تحریروں سے تھا جب انھوں نے آپ کی کتاب "تعبیر کی غلطی" پر محفل نقد سنواری تھی۔ میں بغیر آپ کو پڑھے اور بغیر آپ سے ملے محض اس تنقید سے متاثر ہو کر سوء ظن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب جو آپ کو پڑھا تو واللہ پڑھتا ہی چلا گیا۔ آپ کے سارے پرانے شمارے بھی مسلسل زیر مطالعہ ہیں اور اللہ گواہ ہے، کدورت کے سارے بادل چھٹ گئے ہیں۔ بلکہ آپ کی

عظمت دل پر نقش ہوگئی ہے۔ کاش ایسی عبقری شخصیت سے میں پہلے ہی استفادہ کر لیتا۔
(محمد افضل لادی والا۔ بمبئی)

۱۱۔ مسٹر طارق (کراچی) نے بتایا کہ پاکستان میں الرسالہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔ موجودہ حالات کی بنا پر چونکہ وہاں زیادہ تعداد میں الرسالہ نہیں جا سکتا ہے، اس لیے لوگ ایسا کر رہے ہیں کہ زیراکس کے ذریعہ ایک شمارہ کی کئی کئی کاپیاں نکالتے ہیں اور اس طرح اس کو حاصل کر کے پڑھتے ہیں۔ پھر ایک کاپی کو بھی بے شمار لوگ مہینوں تک پڑھتے رہتے ہیں۔

۱۲ پاکستان سے ایک صاحب لکھتے ہیں: کافی پہلے ایک دوست کے توسط سے الرسالہ سے واقف ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ رسالہ اجتماعیت کا نہیں بلکہ انفرادیت کا قائل ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ الرسالہ پڑھا تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ رسالہ ہندستان کے مسلمانوں کو بزدلی کا درس دیتا ہے اور اسے حکومت کے ایماء پر اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی پر ذہنی طور پر آمادہ کرے۔ اس پہلے تاثر کے بعد میں نے الرسالہ کو دوبارہ نہیں پڑھا۔ ایک دن کتابوں کی ایک دکان پر الرسالہ پر نظر پڑی۔ اس کے بعض جملے دل کو لگے۔ لہٰذا خرید لیا اور گھر آکر ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ ڈالا۔ میرا سابقہ تاثر فوری طور پر زائل ہو گیا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ جب تک الرسالہ کا مطالعہ نہ کر لوں چین نہیں آتا۔ (الیاس اختر انصاری، لطیف آباد، حیدرآباد، سندھ)

۱۳۔ الرسالہ اللہ کے فضل سے نہ صرف دینی، اخلاقی، تعمیری پہلو سے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو رہا ہے، بلکہ اور بھی کئی پہلوؤں سے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مسٹر کشن جیونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) اور مسٹر راج تیواری (بھوپال) نے بتایا کہ انھوں نے الرسالہ اور اس کی مطبوعات کو اردو میں پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھی ہے۔ محترمہ فرزانہ (حیدرآباد) لکھتی ہیں کہ "ایک انگلش میڈیم کی طالبہ ہونے کے باوجود آج میں اردو زبان اچھی طرح لکھنے اور پڑھنے کے قابل جو ہوئی ہوں وہ آپ کی عنایت اور الرسالہ کی بدولت ہے۔ مجھے دین سے اتنی لگن اور محبت الرسالہ کے مطالعہ سے ہوئی۔ میں اب پوری طرح مسلمان ہوں۔ ہر نماز میں آپ کے لیے اور الرسالہ کے لیے دعا کرتی ہوں۔

۱۴۔ ایک نئی کتاب جلد ہی چھپنے والی ہے۔ اس کا نام "راہِ عمل" ہوگا۔

ISLAM

In Contemporary Language

AL-RISALA monthly has a two-fold aim: first, to introduce Islam as a divine message; second, to promote positive and constructive thinking among the people. It is published in Urdu and English by the Islamic Centre, New Delhi.

To receive your copies of this thought-provoking magazine regularly, subscribe NOW.

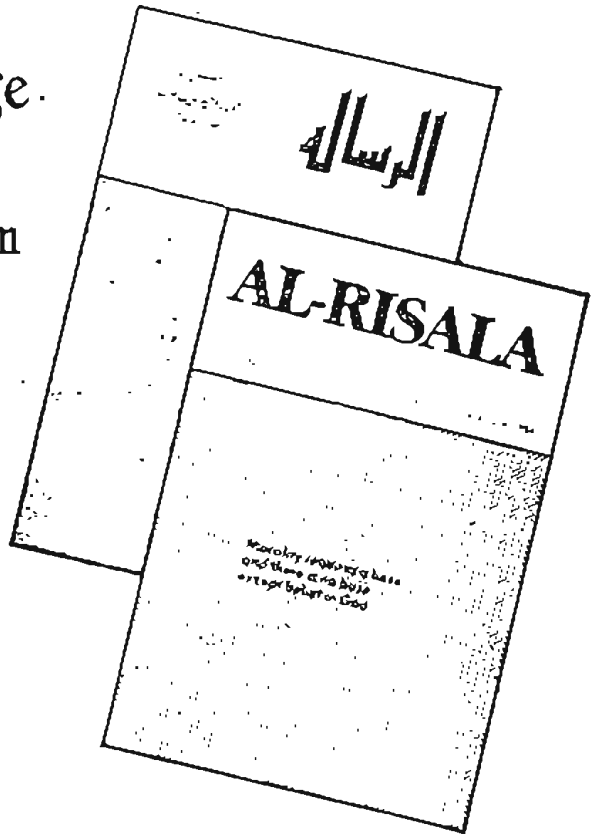

Ask for a free sample copy.

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: _____

Address: _____

_____

_____

_____

Please send a free sample copy of AL-RISALA at the following address:

_____

_____

_____

(Please use a separate sheet for more than one address)

☐ Please send a publications catalogue

Please tick box where applicable

☐ Urdu ☐ 1 year ☐ 3 years
☐ English ☐ 2 years ☐ 5 years
☐ Air-mail ☐ Surface-mail

I am enclosing Cheques/Bank Draft/ Postal Order/M.O. Receipt No. _____

Subscription Rates

INLAND	ABROAD AIRMAIL	ABROAD SURFACE MAIL
1 year Rs 60	Rs 400/$25/£15	Rs 200/$15/£8
2 years Rs 110	Rs 700/$45/£25	Rs 350/$25/£15
3 years Rs 150	Rs 1000/$65/£40	Rs 500/$35/£20
5 years Rs 240	Rs 1500/$100/£60	Rs 750/$55/£30

Pakistan Rs 150 for one year

Supporting Subscription (For One Year)

INLAND.....Rs 300
ABROAD (By Air-mail).....$100/£60

Please send this together with the payment to the Circulation Manager,
AL-RISALA, The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Postal Regd. No D(SE) 243 ☐ RNI 28822/76 ☐ December 1989 No 157 ☐ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
〃 〃 جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
دین کامل	40/-
الاسلام	30/-
ظہورِ اسلام	30/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	50/-
صراطِ مستقیم	30/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	30/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	15/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	6/-

تبلیغی تحریک	15/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	15/-
تعبیر کی غلطی	40/-
دین کی سیاسی تعبیر	12/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	7/-
تجدیدِ دین	
اسلام دینِ فطرت	5/-
تعمیرِ ملّت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	5/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحادِ ملّت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-

زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	3/-
دینی تعلیم	5/-
حیاتِ طیّبہ	4/-
باغِ جنّت	5/-
نارِ جہنّم	5/-

God Arises Muhammad	Rs. 55/-
The Prophet of Revolution	60/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳